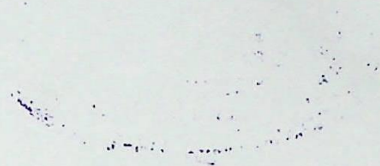
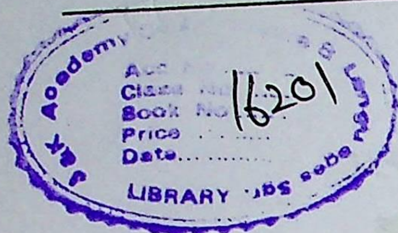
ساتویں در کا شاعر

حکیم منظورؔ



سیّدہ نکہت فاروق نظرؔ





ساتویں در کا شاعر

حکیم منظور

978-93-80691-206

نام کتاب : ساتویں در کا شاعر......حکیم منظور (تحقیق و تنقید)

مصنفہ : ڈاکٹر سیدہ نکہت فاروق نظؔر 9419138215

email:nikhat_q@yahoo.com

سن اشاعت : ۲۰۱۲ء

کمپوزنگ : وسیم احمد

تعداد : 500

سرورق :

قیمت : ۳۵۰ روپے، ۴۵۰ لائبریری ایڈیشن

طابع : میزان پرنٹرس

(یہ کتاب ریاستی کلچرل اکادمی کی جزوی مالی اعانت سے شائع ہوئی ہے)

Title :Satwain Dar Ka Shaiar
Author :Dr. Syeda Nikhat Farooq Nazar
Price :Rs 350, Library Edtion 450
Publisher Syed Fayir Farooq
Mb. 9906068979
94 A-Umarabad, Peer Bagh, Hyderpora
Srinagar-190014

انتساب

اُن کے نام کہ

''جن کی ذوقِ سماعت سے میری آواز معتبر ٹھہری''

اور

اپنی نانی اماں بہشت بریں کے نام کہ

''جن کے حصے میں صرف خزاں کی ٹھہری ساعتیں ہی آئیں''

اپنے شفیق والدین کی

نذر

جن کے سایۂ عاطفت

اور

دعاؤں کے طفیل

میری سوچوں کو شہ پر عطا ہوئے

"مجھے قطعاً یہ خواہش نہیں کہ میں جو نہیں، اُس کا دعویٰ کروں یا دوسروں سے ایسا کہنے کی توقع رکھوں یا ایسا کہلوانے کے لئے جوڑ توڑ کروں، میں جو ہوں وہی ہوں اور اتنا ہی ہوں اور اتنا ہی رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری شاعری کا بہتر استحسان ہو کر ہی رہے گا"

حکیم منظور
سخن برف زاد
(بہ قلم خود)

ساتویں در کا شاعر...... حکیم منظور

ڈاکٹر سیّدہ نکہت فاروق نظرؔ

میری سوچوں کو دے کھلنے کا جواز
اے کلید سیر صد اسرار کھل

فہرست

کتاب سے پہلے

ریاست جموں وکشمیر میں اردو شاعری کے منظر نامے کا کینواس وسیع و عریض ہے۔ جہاں اس میں ندرت اور رنگا رنگی نظر آتی ہے وہیں یہ عمیق غور وفکر کا متقاضی بھی ہے۔ اس شعری منظر نامے کو تشکیل دینے میں کئی شعراء کی شعری کاوشیں شامل رہی ہیں جنہوں نے باضابطہ ایک تحریک کے تحت کام کیا۔ اس سلسلے میں کئی نامور شعراء سامنے آئے۔ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے شعراء میں سے ایک اہم نام حکیم منظور کا ہے جو ریاست اور بیرون ریاست اپنے منفرد فکر وفن کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے کلام کے آئینے میں انہیں Revolutionary شاعر قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو شعری خزینے کو مکمل شناخت عطا کرنے میں حکیم منظور کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو قوت واستحکام بخشا۔ اردو شعر و ادب کی کوئی بھی تاریخ ان کے حوالے کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔ جہاں انہوں نے اپنی شاعری میں جدیدیت کو راہ دی وہیں ان کے کلام میں روایت کی پاسداری کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ انہوں نے روایت اور جدیدیت، دونوں تحریکوں کے منفی اثرات کو ہرگز قبول نہیں کیا بلکہ اپنے اظہار کو راہ دینے کے لئے بیچ کا ایک ایسا راستہ تلاش کیا جس پر چل کر انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو شاعری کے اندر کئی ایسے امکانات موجود ہیں، جن میں جہت آشنا تجربات کئے جا سکتے ہیں۔ انہی امکانی قوتوں کے نتیجے میں وہ اردو کے شعری اُفق پر تابنا کی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

حکیم منظور کی شخصی وشعری ہمہ جہتی اس موضوع کے انتخاب کا موجب بنی۔
جہاں اس کتاب میں حکیم منظور کے کلام کو شعر و ادب کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے وہیں اس میں مقامی پس منظر میں اردو شاعری میں ہو رہے نت نئے تجربات کا تذکرہ بھی ہے اور ریاستی سطح پر شعری تاریخ کا جائزہ بھی۔ یوں بھی کسی شخص کو جاننے، جانچنے اور پرکھنے کا عمل واقعی ایک مشکل امر ہوتا ہے لیکن شاعر یا ادیب چونکہ ایک کھلی کتاب کی مانند ہوتا ہے اور اس کی تخلیقات کی وساطت سے جانچ پرکھ کا یہ عمل کسی حد تک آسان ہو جاتا ہے۔
ویسے حکیم منظور جیسے شاعر کی شاعری کائنات میں سیندھ لگانا دل گردے کا کام ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ موضوع آج تک ان چھوا ہی رہا چونکہ شعر و ادب سے نہ صرف میری دلچسپی رہی ہے بلکہ اکثر و بیشتر شعر کی نزاکتوں کو برتنے کے تجربے سے بھی گزر ہوتا ہے لہٰذا کئی دہائیوں پہلے حکیم منظور کے چند ایک مجموعے احاطۂ مطالعہ میں آئے تھے لیکن اپنی کوتاہ علمی کے سبب بعید از فہم جان کر بقیہ مجموعات کو پڑھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ وقت گزرتے یہ احساس ہوا کہ ریاستی شعری فضا یکسانیت کی دھند میں لپٹی ہوئی ہے اور اس دھند میں حکیم منظور کی شاعری ایک روشنی کی کرن جیسی معلوم ہوئی جو اپنا راستہ آپ تلاش کر کے منزلِ مقصود تک پہنچتی ہے۔ غرض حکیم منظور کی شخصی وشعری ہمہ جہتی اور منفرد لب ولہجہ ان کو بھیڑ سے الگ کر دیتا ہے۔ ان کی شاعری روح کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والے جذباتی تاثر کی آئینہ دار ہے۔ ان کے اشعار میں جدت، ندرت، الفاظ کی برجستگی اور طمانیت سے جہاں قاری کے ذہن میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے وہیں اشعار کی طلسمی فضا قاری پر وجد طاری کرتی ہے۔ ان کے کلام کے منفرد لب و لہجے میں استفہامیہ اندازِ بیان کو خصوصیت حاصل ہے۔ حکیم منظور استعاراتی نظام Develop کرنے میں ماہر ہیں۔ وہ اپنے لئے راستے کا تعین خود کرتے ہیں۔ باسی راہوں پر چلنے سے انہیں کوفت ہوتی ہے۔ حکیم منظور چونکہ ایک Balanced شخصیت کے مالک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان

کی شاعری پرانی روایات کی پاسداری اور جدیدیت کی نمائندگی کی مظہر ہونے کے علاوہ ایک منفرد لب ولہجہ رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں تنوع ہے اور ایسی نئی شاعری کو پرکھنے کے لئے علم کے نہاں خانوں میں نئی روشنی کا اکتساب کرنا ضروری ہے۔ فرسودہ الفاظ کا سانچہ نئی شاعری کی پہچان اور پرکھ کے لئے واقعی ناکافی ہے۔ جب بات حکیم منظور جیسے شاعر کے کلام کی ہو۔ جہاں اشعار کی پرکھ اور پہچان کے لئے قاری یا محقق کے لئے قدم قدم پر چیلنج کا سامنا ہے۔

رقم ہوا ہوں یقین و قیاس دونوں میں
کرے تو کیسے کرے میرا تجزیہ کوئی

حکیم منظور کا مندرجہ بالا شعر واقعی میرے لئے چیلنج ثابت ہوا۔ بہر حال ارادہ یہ ہے کہ میری اس کوشش سے اردو تحقیق میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو۔ کتاب کی ابواب بندی اس طرح ترتیب دی گئی کہ موصوف سے متعلق تمام تر پہلوؤں کی بھرپور عکاسی ہو۔ اس کتاب کی تکمیل کے دوران ایک آزمائش کن مرحلہ تب پیش آیا جب حکیم منظور اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی وفات جہانِ شعر وادب کیلئے کسی سانحے سے کم نہیں اور میرے لئے تو ایک ذاتی صدمہ...... حیات کے عنوان سے جو باب دوم کا پہلا ذیلی حصہ ہے، میں حکیم منظور کی وفات کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ اس کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں راقم نے حکیم منظور سے روبرو کئی ملاقاتیں کیں۔ ان کے گھر جا کر کئی بار انٹرویو کی صورت میں مواد کو ترتیب وار اکٹھا کیا گیا۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ نہایت ہی کار آمد ثابت ہوا۔ ساتھ ہی ان کے قرابت داروں سے خاندانی حالات کی تفصیلی واقفیت حاصل کر لی چند شعری مجموعات کے سلسلے میں حکیم منظور کا خاصا تعاون حاصل رہا اور جو مجموعے موصوف کے پاس نہ تھے ان کے لئے بھی راقم کو جگہ جگہ کی خاک چھاننا نہ پڑی کیونکہ ان کے اکثر مجموعے اردو شاعری کے سنجیدہ قارئین سے حاصل ہوئے۔ اس بات سے یہ

اندازہ لگایا گیا کہ حکیم منظور کے حلقہ قارئین میں کشادگی بھی ہے اور سنجیدگی بھی۔

کئی نامور ادبی ہستیوں کی رہنمائی اس کتاب کی تکمیلیت کا باعث بنی۔ ان حضرات کے مفید مشوروں سے میرا حوصلہ بڑھا۔ میں ان تمام حضرات کی ممنون و مشکور ہوں۔ خصوصاً پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر بشیر احمد نحوی، پروفیسر مجید مضمر، پروفیسر سکھ چین سنگھ، جناب ظریف احمد ظریف، جناب ڈاکٹر لطیف میر، ڈاکٹر شاہ نواز اور جناب پرویز مانوس، ان تمام حضرات کا تعاون میرے لئے بارِ عظیم سے کم نہیں۔

ایک ایسی شخصیت جس نے اس تمام کام کے پس پردہ ایک محرک کا کام کیا وہ میرے شریک حیات جناب سیّد فاروق صاحب ہیں۔ ان کے تعاون کے بغیر شاید میں یہ کام ہاتھ میں بھی نہ لے سکتی تھی۔ ان کے اس تعاون کا شکریہ ادا کرنا میرا فرضِ اولین ہے۔

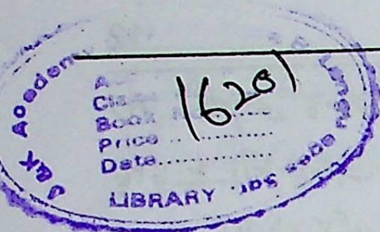
کمپوزنگ سے اشاعت تک کے تمام مراحل میں جس تندہی اور لگن کا مظاہرہ عزیزی سیّد یاسر فاروق اور سیّد سائر فاروق نے کیا، وہ واقعی قابل داد ہے، خدا ان کے حق میں تمام تر عنایتیں عطا فرمائے۔

حکیم منظور کے فن اور ان کی شخصیت پر لکھی گئی یہ پہلی ضخیم کتاب ہے لہٰذا یہ کاوش اولین نوعیت کی ہے۔ اس سلسلے میں ادب دوست اور ادب نواز حضرات سے میرا التماس ہے کہ سچے قارئین کا حق ادا کرتے ہوئے وہ اپنی قیمتی آراء سے ضرور نوازیں گے۔

ڈاکٹر سیّدہ نکہت فاروق نظر

31 دسمبر 2011

سرینگر کشمیر (انڈیا)



دیباچہ

فکرودانش، کسی جنس مخصوص کی ملکیت نہیں لہٰذا ادب کی تخلیق سے قطع نظر ادب کی تفہیم وتعبیر کے عمل کو لیڈیز اور جینٹس کمپارٹمنٹ میں تقسیم کرنا ایک مضحکہ خیز عمل ہی کہلائے گا لیکن چونکہ ادب وثقافتی سرگرمیاں اپنی زبان اور زمانہ سے متعلق بصیرتوں کا پتہ بھی دیتی ہیں لہٰذا ہندوپاک جیسے ممالک میں جو ابھی تک نوآبادیاتی مزاج اور اقدار سے نجات حاصل نہیں کرسکتے ہیں، عصری ادبی ومعاشرتی شعور کے معیار اور جہات کا اندازہ لگانے کے لئے، خواتین کی تخلیقی نگارشات کے ساتھ ساتھ ان کی تنقیدی کاوشوں کو بھی زیر بحث لانا ایک سنجیدہ اور ناگزیر فریضے کی ادائیگی سے کم نہیں ہوگا۔

المیہ یہ ہے کہ اردو کے تخلیقی ادب میں خواتین کا حصہ لائق اعتبار ہی نہیں باعث افتخار بھی ہے لیکن تنقیدی ادب میں اپنی بصیرتوں کا مظاہرہ کرنے والی خواتین کم ہی ہیں۔ اس ضمن میں ممتاز شیریں کے بعد کوئی ایسی خاتون نظر نہیں آتی جس نے "معیار تنقید" کی تشکیل میں کوئی اہم کارنامہ انجام دیا ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ قرۃ العین حیدر، سیدہ جعفر، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، جیلانی بانو، کشور ناہید، شفیقہ فرحت اور فہمیدہ ریاض سے لے کر عذرا پروین، شہناز نبی اور ترنم ریاض تک متعدد خواتین نے اپنی جستہ جستہ تحریروں کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی تحقیقی صلاحیتوں اور تنقیدی بصیرتوں کو تواتر اور دلجمعی کے ساتھ اظہار کرکے تنقید کی تصویر کائنات میں بھی رنگ بھر سکتی ہیں۔

اس پس منظر میں سیدہ نکہت فاروق نظر کی تحقیقی وتنقیدی تصنیف "ساتویں در کا

شاعر...... حکیم منظور'' کا مطالعہ بھی ہر طرح کے تعصّبات اور مفروضات سے بلند ہوکر کیا جانا چاہیئے۔ ڈاکٹر سیدہ نکہت فاروق نظرؔ نئی نسل کی ایک جانی پہچانی شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ ''قہر نیلے آسماں کا'' ریاست جموں وکشمیر کے روز وشب کی خون آشامی کے علاوہ اس ریاست کے بند ماحول میں عورت کی فکری پرواز کے امکانات اور حد بندیوں کو بھی سامنے لاتا ہے۔نکہت کی شاعری بھی یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنی ذات کا عرفان رکھتی ہے بلکہ اس کے پاس اپنے معاشرے اور اپنی ثقافت کی تاریخ ہی نہیں عصری منظرنامے کا گہرا شعور ہے۔نکہت کے اشعار اور افسانے ریاست جموں و کشمیر کی عصری زندگی کے ''شور'' اور ''خاموشی'' کو کمال فنی و جمالیاتی دروبست کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

سیدہ نکہت فاروق نے اپنے اس ہمہ جہت شعور کا مظاہرہ مشہور اردو شاعر حکیم منظور کے فن اور شخصیت کے تحقیقی وتنقیدی جائزہ میں، اپنی تمام تر محفوظ اور متحرک بصیرتوں کے ساتھ کیا ہے۔خاص بات یہ ہے کہ نکہت نے جو کچھ بھی لکھا ہے، عمدہ اور پرتاثیر زبان میں لکھا ہے، ایسی زبان عام طور پر کشمیر کے نثر نگاروں کے یہاں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اکثر و بیشتر ادیب اردو میں نثر تو لکھتے ہیں لیکن نثر میں اردو لکھنے کی مثالیں محمد یوسف ٹینگ اور شمیم احمد شمیم جیسے چند گنے چنے نثر نگاروں کی تحریروں میں ہی ملتی ہیں۔نکہت کے یہاں تحقیقی افکار اور تنقیدی نتائج کا بیان کیسی عمدہ رواں اور باا ثر اسلوب میں کیا گیا ہے، اس کا اندازہ ''حکیم منظور فن اور شخصیت'' کے ان اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے:

ا۔ ''حکیم منظور کے ہاں آفتاب ایک ایسی علامت بن گیا ہے جو ان کے کلام میں جگہ جگہ روشنیاں بکھیرتا ہے۔ جہاں ان کے موزوں طبیعت کو ذہنی غذا عطا کرتا ہے وہیں یہی آفتاب ان کے شبنمی وجود کو پل بھر میں نگل جاتا ہے۔ عالم ممکنات میں شاعر پر آفتاب کا نازل ہونا پاکیزگی کی دلیل ہے۔حکیم منظور کے

ہاں ایک نئی اور ان دیکھی لفظوں کی دنیا کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ آفتاب کی روشنی کے ساتھ ہی وحی کا سا عالم طاری ہوتا ہے جہاں شاعر خود نہیں جانتا کہ کون سا نیا لفظ یا نیا خیال اس پر نازل ہو رہا ہے''۔

۲. ''۱۹۴۰ کے بعد ملک گیر پیمانے پر ادب میں نئے موضوعات، تصورات، رویوں اور تحریکوں نے ابھرنا شروع کیا...... شعراء و ادباء نئی سمتوں اور نئے راستوں پر لگ گئے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں ریاست (جموں و کشمیر) کا اردو شاعر ان نئی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ سستی جذباتیت اور کھوکھلے نعروں کا دور ختم ہو چکا تھا نتیجتاً یہاں کے اردو شعراء براہ راست ان نئے تقاضوں کا اثر قبول کرتے چلے گئے۔

نکہت یہ مانتی ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر کے نئے شعرا نے نئے ذہن کے ساتھ اپنے عہد کی ترجمانی کر کے عصری آگہی کا ثبوت دیا۔ نئے شعری رجحانات اور تراکیب کے ذریعے انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور منفرد اسالیب کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ داخلیت پسندی کے رجحان کے ساتھ ان کا تخیل نئے شعری آفاق کو چھونے لگا وہ بنیادی طور پر انسانی اقدار کی پامالی اور بے حرمتی کے دلدوز مناظر کے نوحہ خواں بن گئے...... اس طرح کے شعراء میں سب سے بڑا نام حکیم منظور کا ہے۔

سیدہ نکہت فاروق نظر نے حکیم منظور کی شاعرانہ عظمت و انفراد کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر منظر اعظمی، پروفیسر غلام رسول ملک، مظہر امام، غلام نبی ناظر، منیب الرحمٰن، پروفیسر قدوس جاوید اور مشفق خواجہ وغیرہ کے حکیم منظور پر لکھے گئے مقالوں کے حوالے سے، حکیم منظور کی شاعری کے فنی و جمالیاتی، لسانی و فکری جہات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اسی لئے حکیم منظور پر نکہت کا مقالہ، ایک عمدہ تحقیقی و تنقیدی کارنامے کا حامل ہو گیا ہے۔ نکہت نے حکیم منظور کی شاعری سے متعلق جو نتائج اخذ کئے

ہیں وہ نکہت کے تنقیدی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی تصنیف ''ساتویں در کا شاعر......حکیم منظور'' کے چند اقتباسات خصوصی طور پر متوجہ کرتے ہیں:

۱. حکیم منظور کے شعری خزانے میں ایسے کئی شعری تجربات شامل ہو چکے ہیں جو نہ صرف اچھوتے اور ان چھوئے ہیں بلکہ نادر اور لا مثال بھی ہیں......روز مرہ استعمال میں لائے جانے والے عام الفاظ کو وہ منفرد شاعرانہ پیکر میں ڈھال کر عارفانہ رنگ عطا کرتے ہیں۔ گونگی خوشبو، کچے کھلونے، مسکراتی برف، روتی دھوپ، بادامی بدن، برف تن، دھوپ دیوتا جیسے انسلاکات کا استعمال ان کی شاعری کو اچھوتا رنگ عطا کرتا ہے۔ موسم، پیڑ، سمندر، صحرا، پھول، پھل اور جھیلوں کے ذکر سے ان کی شاعری میں تفاعلی ماحولیات کا عنصر اُبھرتا ہے۔

۲. حکیم منظور کے ہاں مقامی دریاؤں، جھیلوں اور جگہوں، موسموں اور شخصیات کا ذکر ان کی اپنی زمین سے جڑے ہونے کا ثبوت دیتا ہے، گلاب، جہلم، ولر، ڈل، اہرہ بل، مانس بل، سیب اخروٹ، بادام، برف باری، کانگڑی، پھرن جیسے کئی الفاظ افراط سے ملتے ہیں۔ میرک شاہ اندرابی، انور شاہ لولابی اور حسن کوزہ گر جیسی مقامی شخصیات کا ذکر اس بات کا ثبوت ہے کہ حکیم منظور اپنی شاعری کے ذریعے اپنی ثقافتی اور معاشرتی روایات اور اقدار کو زندہ و پائندہ رکھنے کا اہم ترین فریضہ انجام دیا ہے۔ دراصل ایک سچا شاعر اپنی مٹی سے الگ سوچ ہی نہیں سکتا جس مٹی سے اس کا خمیر اُٹھا ہو۔

حکیم منظور کی شخصیت کا گہرائی سے جائزہ لیتے ہوئے نکہت نے، اُن کے دینی شعور خصوصاً عشق رسول کے حوالے سے کئی ایسے نمایاں افروز حقائق و کیفیات کا ذکر کیا ہے جن سے حکیم منظور کے ساتھ قربت قریبہ رکھنے والے اعزہ اور احباب ہی واقف ہوں گے۔ ذکر محمدیؐ کے ساتھ ہی آنکھوں کے بھر آنے اور کسی آیہ کریمہ یا حدیث مبارکہ کو سنتے

ہی رو پڑنے جیسی کیفیات کے گواہ کئی لوگ ہیں لیکن اسلام، کلام پاک اور سیرتِ رسولؐ پاک سے متعلق گفتگو کے دوران وہ اپنا نقطہ نظر دوسروں سے منوانے پر اسرار نہیں کرتے تھے۔ وضع داری، رواداری، انسان دوستی، غیرت وحمیت، ایمانداری اور جان سوزی ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے۔ نکہت نے بڑے ہی غیر جانبدارانہ انداز میں، اپنی سطح سے، حکیم منظور کے فن اور شخصیت کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، دلائل کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ کشمیر کا بڑے سے بڑے شاعر کا قد حکیم منظور کے سامنے چھوٹا نظر آتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے ممتاز شاعر اور نقاد حامدی کاشمیری نے کبھی حکیم منظور کو سنجیدگی سے نہیں پڑھا اور نہ ان پر یہ اکتشاف مشکل نہ تھا کہ حکیم منظور عصری اردو شاعری میں کس مقام اور مرتبہ پر فائز ہیں۔ یہ کام سیدہ نکہت فاروق نظؔر نے کر دکھایا ہے۔ نئی نسل کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو اپنے شعری وادبی سرمایہ کے حقیقت پسندانہ محاسبے سے روکا نہیں جاسکتا۔ سیدہ نکہت فاروق کی تصنیف ''ساتویں در کا شاعر...... حکیم منظور'' اس کی عمدہ مثال ہے۔

پروفیسر جاوید قدوؔس

عصرِ حاضر میں جموں و کشمیر میں اُردو شاعری

صدیوں پر پھیلی ہوئی تہذیبی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مختلف قوموں، فرقوں اور قبیلوں کی آمد اور آباد کاری کے نتیجے میں زبانوں کی پیدائش اور نشو نما ہوئی ہے۔ زبانیں سرحدیں پھلانگ کر ہمیشہ پابہ سفر رہتی ہیں۔ صدیوں کے تہذیبی سفر میں اس کا واسطہ بہت سی قوموں اور نسلوں سے پڑتا ہے اور گونا گوں تجربات کے ساتھ ساتھ کئی نسلوں کا خونِ جگر اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ زبان کی پیدائش اور ارتقاء کا عمل بے حد پیچیدہ اور پر اسرار ہوتا ہے۔ مختلف بولیوں اور زبانوں کے الفاظ اور محاورے باہم مل جل کر زبان کی ایک نئی صورت کو جنم دیتے ہیں۔ مدتوں بعد جب اِس کی ایک واضح شکل متعین ہو جاتی ہے تو لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی زبان کا وجود عمل میں آیا ہے۔

اُردو زبان کی ابتداء چاہے کسی بھی زمانے میں ہوئی ہو اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ گیارہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی پنجاب میں آمد سے اس کے تشکیلی عمل کو نہ صرف مہمیز ملی بلکہ اس کے اثرات ریاست کی لسانی صورتحال پر بھی پڑے اور یہاں بھی اُردو زبان کی ترویج کے لئے زمین ہموار ہوتی چلی گئی۔ کیونکہ اردو زبان سرحدوں کو روندتی ہوئی آگہی کا نور بن کر ریاست میں داخل ہونے میں کامیاب ہو چکی تھی اور ریاست جموں و کشمیر چونکہ تین خطوں (جموں، کشمیر، لداخ) پر مشتمل ریاست ہے۔ تینوں خطوں میں الگ الگ زبانیں ڈوگری، کشمیری اور

لداخی بولنے کا چلن ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہاں کئی مقامی بولیاں بھی رائج ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی محسوس کی گئی کہ ایک آپسی رابطے کی زبان ہو جو نہ صرف تینوں خطوں کے لوگوں کیلئے آپسی ذریعہ اظہار کا وسیلہ بن سکے بلکہ ملک اور بیرونِ ملک کے لوگوں کے ساتھ لسانی رشتے قائم کرنے میں بھی آسانیاں میسر آئیں۔

ریاستی سطح پر اُردو زبان کا جائزہ لیا جائے تو اس بات کے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ اُردو زبان کا باقاعدہ آغاز ڈوگرہ حکمرانوں کے دور سے شروع ہوتا ہے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ نویں صدی سے چودہویں صدی تک ہندو حکمرانوں کا دورِ عروج تھا۔ چودہویں صدی میں مسلمانوں کا دورِ اقتدار رہا۔ اس کے بعد سکھوں اور ڈوگروں نے حکومت کی۔ اس تاریخی عمل کے نتیجے میں یہاں مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ دوسری اہم زبانیں بھی پنپیں اور اُن کو پھلنے پھولنے کے بھرپور مواقعے حاصل ہوتے رہے۔ ریاست کا علاقہ چونکہ ایک مدت تک پنجاب کا ہی حصہ رہا ہے۔ اسلئے زبان کے سلسلے میں وہاں ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات یہاں بھی مختلف ذرائع سے مرتب ہوتے رہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں بھی وہ زبان رواج پاتی چلی گئی جس نے رفتہ رفتہ نہ صرف پنجاب بلکہ ملک کے دیگر حصوں میں اپنے جھنڈے گاڑھ دیئے تھے۔

ڈاکٹر نذیر احمد ملک اُردو زبان کے لسانی پہلو پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "لسانی اعتبار سے ریاست جموں و کشمیر کئی بولیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مثلاً کشمیری، ڈوگری، لداخی وغیرہ لیکن سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے اُردو ریاست کے تینوں خطوں کے درمیان رابطے کی زبان کے طور پر کام کر رہی ہے۔ اس طرح تینوں خطوں کے باشندوں نے اس کو ایک تہذیبی زبان کی حیثیت سے قبول کیا ہے اور اس زبان کے ذریعے

ہندوستان کے ساتھ تہذیبی رشتے قائم رکھے ہوئے ہیں۔"۱

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو انیسویں صدی کے نصف آخر میں متعارف ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ڈوگرہ شاہی حکومت قائم تھی۔ اس زمانے میں ریاست کے پنجاب اور یوپی کے نواحی علاقوں سے بہت گہرے اور قریبی تعلقات تھے اور وہاں اُردو زبان کی مقبولیت کا پرچم شان وشوکت کے ساتھ لہرا رہا تھا اور اس پرچم کے زیرِ سایہ کئی نامور شعراء اور ادیب اپنی شعری وادبی کاوشوں کے ذریعے اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ یہ ادباء وشعراء وارِدِ ریاست ہو کر اُردو کی مقبولیت کا سبب بنے۔ ساتھ ہی ساتھ کئی صوفی بزرگوں کی آمد سے بھی اس زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ صوفی بزرگوں، شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ عام آدمی جیسے تاجر، سیاح، سرکاری ملازم وغیرہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہے جس سے اُردو زبان اثر قبول کرتی رہی۔ ۱۸۶۲ء میں طبقات الاراضی کے ماہر فرڈرک ڈریو ریاست میں اُردو کی مقبولیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان سے آنے والے ملازم لوگ بلاشبہ ہندوستانی (اُردو) بولتے ہیں اور مقامی لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں۔۲

جہاں تک کشمیر میں اُردو زبان کا تعلق ہے یہ وہاں فارسی کی تہذیبی لہر کی رو میں پہنچی۔ چونکہ یہی زبان اسلامی تعلیمات کی قاصد اور سفیر بھی تھی اس لئے سیاسی اقتدار اور مذہبی اعتقاد جیسے کلیدی عوامل نے اس کی پشت پناہی کی اور یہ زبان کشمیر کی تہذیبی زندگی پر چھا گئی۔

کشمیر میں اردو کو فارسی کی تہذیبی پرورش کی زائیدہ بتاتے ہوئے سروری

۱...... ڈاکٹر نذیر ملک۔ کشمیر میں اُردو۔ ایک لسانیاتی جائزہ۔ تعمیر۔ جموں وکشمیر اردو ادب نمبر ص ۴۳

۲...... حامدی کاشمیری۔ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ادب۔ گلشن پبلشرز۔ سرینگر ۱۹۹۱۔ ص ۶۹

صاحب اپنی کتاب ''کشمیر میں اُردو'' میں اُردو زبان کے پھیلاؤ کے تین عناصر بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ذرائع آمدورفت میں آسانیاں فراہم ہونے لگیں اور کشمیر آنا صرف بادشاہوں اور ان کے مشیروں و مصاحبوں کا ہی شغل نہ رہا۔ دوسری طرف فارسی کے چراغ کا روغن سوکھنے لگا۔ تیسرا اہم واقعہ یہ رونما ہوا کہ مسلمانوں کا بہت سا مذہبی سرمایہ اُردو میں بھی بہم ہونے لگا۔ ان تمام عناصر و عوامل نے کشمیر کو اُردو کے محور میں پھینک دیا۔''[1]

جہاں تک ریاست میں تحریری سطح پر اُردو کی عمر کا سوال ہے یہ دو سو سال کے عرصے سے زیادہ نہیں۔ جب کہ تخلیقی سطح پر یہ اُس سے بھی کم ہے۔ تاہم اس قلیل عرصے میں بھی یہاں جو شعروادب تخلیق ہوا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اُردو شعروادب کے میدان کی تاریخ تب تک نامکمل ہوگی جب تک کہ ریاستی سطح پر شعروادب کے میدان میں ہو رہے تجربوں کو اس میں مناسب و موزوں جگہ نہیں ملے گی۔ سروری صاحب کشمیر کی زمین کو اُردو کے لئے مناسب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ گل زمین اُردو کے پودے کو بڑی راس آئی اور اس نے یہاں کی مٹی کی طرح یہاں کے زرخیز ذہنوں میں نمو پا کر تخلیق و تحریر کا ایک گھنا جنگل اُگا دیا۔''[2]

۱۸۴۶ء میں جب ریاست جموں و کشمیر میں ڈوگرہ شاہی حکومت قائم ہوئی تو ملک کے دیگر حصوں کی طرح یہاں کی درباری زبان بھی فارسی ہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کو فارسی کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے کا موقعہ حاصل ہوا اور اسی کی سرپرستی میں وہ عوام میں قبولِ عام حاصل کر لی گئی اور وہ اشتہار اُردو کی مقبولیت کے شاہد ہیں جو

---

۱ ..... عبدالقادر سروری۔ کشمیر میں اُردو، کلچرل اکادمی۔ سرینگر ۱۹۸۲۔ جلد دوم۔ ص ۱۷

۲ ..... عبدالقادر سروری۔ کشمیر میں اُردو۔ کلچرل اکادمی۔ سرینگر۔ ۱۹۸۲ء جلد سوم۔ ص۔ ۸

مہاراجہ گلاب سنگھ کے زمانے میں عوام کی اطلاع کیلئے سرکاری طور پر جاری ہوتے رہے اور جن کی نقول آج بھی ریاستی آرکائیوز میں محفوظ ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۶۔۱۸۸۵) نے جو کہ خود آرٹ اور فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے اردو کی ترویج کیلئے نہ صرف پاٹ شالائیں، مدرسے اور ادبی مراکز قائم کئے بلکہ فروغ اُردو کیلئے بیرونِ ریاست سے مختلف زبانوں کے مشہور و معروف محقق اور قلم کار حضرات کو بلوایا تا کہ اس زبان میں مختلف تجربات کئے جائیں۔ اسی عہد میں کچھ ادبی یادگار نمونوں کا ترجمہ مقامی زبانوں یعنی ڈوگری، اُردو اور ہندی میں کرایا گیا۔ اس طرح اُردو زبان مقبولیت کے زینے چڑھتی گئی۔ ڈاکٹر ظہور الدین اس بات کے اعتراف میں لکھتے ہیں:

"Urdu language had become so popular in the region that the people whether educated or illiterate could easily understand it."

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی پر خلوص سرپرستی ہی کے نتیجے میں جموں میں ایک ادبی اور علمی سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جو بدیا بلاس کے نام سے جانی جاتی تھی اور جس میں مختلف زبانوں کے نامور محققین حصہ لیتے تھے اور باقاعدگی سے ہر ہفتے مہاراجہ کی سرپرستی میں محفلوں کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ اخیر میں 'وکرم بلاس' پریس قائم ہوا اور اسی پریس کے زیر اہتمام 'بدیا بلاس' نام کا ایک اخبار ہندی اور اُردو زبانوں میں مشترکہ طور پر شائع ہونے لگا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد کی ابتداء میں جموں میں 'احمدی پریس' کا قیام عمل میں آیا جس میں سرکاری کاغذات فارم وغیرہ اُردو میں بھی چھپتے تھے اور یہیں سے ہرگوپال خستہ کا 'تحفۂ کشمیر' نام کا سرکاری

1- Dr. Zahur-U-Din- Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region- Gulshan Publications- Page-24

اخبار نکالتا تھا۔ یہ اُردو کی خوش نصیبی تھی کہ اس نے ادبی سطح پر نہ سہی لسانی سطح پر بہت جلد اپنے پیر مضبوطی سے جما لئے اور اس خطے میں رابطے کی زبان بن گئی۔ ایسی صورتحال کے پیش نظر مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ اس سلسلے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''ڈوگرہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ اُردو پٹوار خانے سے لے کر عدالتوں اور پھر دفتروں اور دربار ہر جگہ دخل انداز ہوگئی۔ اُردو مدرسوں میں پڑھائی جانے لگی۔''[۱]

اس بات کی تائید کرتے ہوئے حامدی صاحب لکھتے ہیں:

''اردو زبان کا چلن ریاست میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا اور کچھ عرصے بعد ریاستی سرکار نے اس کی مقبولیت کو دیکھ کر اسے سرکاری زبان کا منصب عطا کیا اور سرکاری دفاتر میں بھی اس کا رواج ہوا۔''[۲]

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور میں سیاسی افراتفری کی وجہ سے اُردو کو کوئی خاص ترقی حاصل نہ ہوسکی لیکن ان کی ایک کامیاب کوشش یہ رہی کہ انہوں نے بیرونِ ریاست سے کچھ مشہور ومعروف محقق اور شعراء کو اپنی حکومت میں اونچے عہدوں پر فائز کیا جن میں خوشی محمد ناظر، اثر لکھنوی، پنڈت دتاتریہ کیفی تھے۔ ان عظیم ہستیوں کی موجودگی میں ریاست میں اُردو کی ترقی کا ماحول پیدا ہوگیا۔

اُردو میں شعری مزاج کو جلا بخشنے کی اہم کوشش تب ہوئی جب ۱۹۱۱ء کے آس پاس 'بزم سخن جموں' نام سے ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن نے نہ صرف باقاعدہ شعری نشستیں منعقد کرنے کا سلسلہ شروع کیا بلکہ مشاعروں کی روایت کو بھی

۱...... عبدالقادر سروری۔ کشمیر میں اُردو۔ جلد دوم۔ ص۔ ۱۸

۲...... حامدی کاشمیری۔ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ادب۔ گلشن پبلشرز۔ سرینگر۔ ص۔ ۳۸

طرح ملی۔اس طرح سے مقامی شعراء کو بیرونی شاعروں سے ملنے اور ان کی تخلیقات سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔

ریاست میں چونکہ تحریر وتقریر کی آزادی مفقود تھی اس لئے یہاں کی شعری تخلیقات ریاست سے باہر چھپنے والے اخباروں اور جریدوں میں شائع ہوتی رہیں۔لیکن ۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف کی کوششوں سے ریاست کا پہلا مکمل اخبار ''رنبیر' جاری ہوا اور یہاں کے شعر وادب کی روایت کو طرح ملی ۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۰ء تک چلتا رہا اور ریاست میں مکمل شعری منظر نامہ تشکیل پاتا گیا۔ساتھ ہی شعری سرمایہ جمع ہونے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔کئی شعراء اُردو کو وسیلہ اظہار بنا کر اپنی بساط کے مطابق اُردو شعری سرمایہ میں اضافہ کرتے رہے۔ان کی منظومات مخزن اور دیگر اخباروں کے ادبی ایڈیشنوں میں چھپتی رہیں۔ ۱۹۴۷ء تک ایک خاص رنگ غالب رہا۔جس میں غیر ملکی حکمرانوں اور شخصی حکومت کے ظلم وستم کی داستان اور اس حالتِ غلامی سے چھٹکارا پانے کی خواہشوں نے مختلف رنگ وروپ میں شعری تخلیقات میں جگہ پائی ۔کہیں مذہبی موضوعات کا غلبہ رہا تو کہیں وطنیت کے راگ الاپے گئے ۔انسانیت دوستی اور فطرت نگاری بھی شعراء کے محبوب موضوعات میں شامل رہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ریاست میں عوامی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی نیا کشمیر کے آئینی منصوبے میں اُردو کو سرکاری زبان تسلیم کیا گیا۔اس دور میں یہاں کے اکثر نوجوان شعراء استاد جوش ملسیانی اور سیماب اکبر آبادی جیسے شعراء کے زیر اثر رہے۔حفیظ جالندھری کی رومانی اور فطری شاعری کا اثر بھی یہاں کے مقامی شعراء نے قبول کیا۔عبد القادر سروری لکھتے ہیں:

''جموں کے نوجوان شعراء پر ملحقہ علاقے پنجاب کے مسلم الثبوت اُستاد جوش ملسیانی کا گہرا اثر رہا۔جوش شعر میں آدابِ شاعری اور زبان میں آدابِ محاورہ کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے

تھے۔ اسکا اثر نئی نسل کے شعراء پر اتنا گہرا ہے کہ وہ نہایت سڈول شعر آسانی سے کہہ لیتے ہیں۔ کشمیر کے نوجوان شعراء کی تربیت سیماب اکبر آبادی جیسے سخنور کی مخصوص روایات میں ہوئی۔ سیماب آدابِ شاعری زبان اور محاورہ کی نگہداشت میں جوش سے پیچھے نہیں تھے۔"[1]

اس طرح ریاستی سطح پر شعراء کی ایک نئی پود کی تیاری میں زمین ہموار ہوتی گئی اور اپنی اپنی بساط کے مطابق شعراء فعال ذہن اور عصری آگہی کا ثبوت دیتے رہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں کے اُردو شعراء کے موضوعات کے بارے میں حامدی صاحب رقمطراز ہیں:

"آزاد اور حالی کے بعد متبعین مثلاً سلیم محروم، چکبست وغیرہ کے شعری رجحانات مثلاً وطنیت انسانی دوستی اور فطرت نگاری سے بھرپور آگاہی بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں کے اُردو شعراء کے کلام میں ملتی ہے۔"[2]

ملک میں جب ترقی پسند تحریک رونما ہوئی تو ریاست کی ادبی فضا پر بھی اس کے خاصے اثرات پڑے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر یہاں بھی جگہ جگہ ادبی انجمنیں قائم ہوئیں۔ خاص طور پر انجمن ترقی پسند مصنفین جموں، بزمِ ادب کشتواڑ، بزمِ ادب پونچھ نے خاصا کام انجام دیا۔ اس طرح ترقی پسند نظریات کو نہ صرف ادب میں فروغ دیا گیا بلکہ ادب کے فنی پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے ایک توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی۔ غلام نبی ناظر اپنے مضمون "کشمیر میں اُردو کے پچاس سال" میں لکھتے ہیں:

---

1 ..... عبدالقادر سروری۔ کشمیر میں اُردو۔ حصہ سوم۔ ص۔۲۴

2 ..... حامدی کاشمیری (مضمون) اُردو شاعری کے نئے رجحانات۔ رسالہ۔ ہمارا ادب۔ ص۔۱۰۵

"اردو ادب و شعر کو بھی ترقی پسند رویئے نے متاثر کیا۔ اگرچہ ادب کی راہیں روایتی تھیں لیکن اب یہ راہیں زندگی کی خاطر کھلنے لگیں اور ادب برائے ادب کی جگہ ادب برائے زندگی کا نظریہ سامنے آیا۔"[1]

ریاست میں اُردو شاعری کی ابتداء تقریباً آزادی کے آس پاس ہوئی۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اُردو شاعری میں اُنہی شعری رجحانات کی نمائندگی ہوتی رہی جو ۱۹۴۵ء سے قبل اردو شاعری پر غالب تھے۔ بیسویں صدی کے وسط میں چند اہم شعری رجحانات مثلاً اقبالیت، وطن پرستی، سیاسی بیداری، انقلاب پرستی اور اشتراکیت کا اظہار یہاں کے نمائندہ شعراء نے اپنی شعری کاوشوں کے ذریعے کیا۔ ان میں میر غلام رسول نازکی، شہ زور، طالب کشمیری، میکش کاشمیری، کشن سمیل پوری، عبدالحق برق، مہندر رینا، عشرت کاشمیری، تنہا انصاری، عرش صہبائی وغیرہ ہیں۔ اس ضمن میں ان شعراء نے نہ صرف فکر و نظر کی بیداری کا ثبوت فراہم کیا بلکہ اسلوب و اظہار کی مروجہ خصوصیات کو بھی فنی آگاہی کے ساتھ برتنے کی کوششیں کیں۔ شہ زور، نازکی اور طالب کے نام اس ضمن میں خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان شعراء کے ہاں روایت کا صحت مند احساس ملتا ہے ساتھ ہی زبان و بیان کا رچاؤ اور پختگی بھی موجود ہے۔

آزادی کے بعد ریاست میں اُردو شعر و ادب کی کئی نسلیں پروان چڑھتی گئیں۔ ان میں کچھ تو قدیم روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ نئی قدروں کا بھی احترام کرتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو قدیم روایات سے مکمل انحراف کر کے جدید ذہن کے ساتھ بدلتی جہتوں کو اپنے اندر سمو لینے کی چاہ رکھتے ہیں۔

روایات کی پاسداری کرنے والے اور نئی قدروں کا خیر مقدم کرنے والوں کے بیچ اگر حد فاصل کھینچی جائے تو عصرِ حاضر تک ہمیں شعراء کو چار گروہوں میں تقسیم

[1]...... غلام نبی ناظر۔ شیرازہ۔ مضمون "کشمیر میں اُردو کے پچاس سال"۔ ص۔۱۱۸ شیرازہ۔ رسالہ۔ جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز

کرنا پڑے گا۔ دورِاول میں تو وہ شعراء سامنے آئیں گے جن کی کاوشوں سے اُردو کو نہ صرف شعری منظر نامہ عطا ہوا بلکہ اُردو زبان کے پنپنے، پھلنے، پھولنے میں انہوں نے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ ان شعراء نے پرانی طرز میں غزلیں لکھیں۔ روایت کے دامن کو تھامے ہوئے اُردو غزل کو عشق، بے ثباتی دنیا، موت اور تصوف کے دائرے میں محدود رکھا۔ ان شعراء میں پنڈت ہرگوپال خستہ، صادق علی خان، مرزا مبارک بیگ، مرزا اسعدالدین سعد، راجہ شیر علی خان، تاراچند ترژل، کاشی ناتھ ترژل، خان صاحب، منشی سراج الدین، خوشی محمد ناظر، قمر قمرازی، ڈاکٹر عمادالدین سوز، حبیب کیفوی، قیس شیروانی، وشوناتھ درماہ، اللہ رکھا ساغر، حمید نظامی اور غلام حیدر چستی قابل ذکر ہیں۔

شاعری کے دوسرے دور کی صف وار ترتیب اس طرح ہے: پروفیسر طالب کاشمیری، شہ زور کاشمیری، مرزا کمال الدین شیدا، غلام رسول نازکی، دینا ناتھ مست، منوہر لال دل، میکش کاشمیری، شوریدہ کاشمیری، رسا جاودانی، غ،م، طاؤس، تنہا انصاری، کشن سمیل پوری، عبدالحق برق، سیفی سوپوری، عشرت کشتواڑی، اکبر جے پوری، غلام علی بلبل، عرش صہبائی اور قیصر قلندر۔ ان شعراء نے زیادہ تر زندگی اور زندگی سے متعلق مسائل کو زیر بحث لایا ہے تاہم سیاسی کشمکش، قدرتی مناظر، قومیت اور انسان دوستی کے عنوانات کو بھی جگہ دی ہے۔ بیانیہ نظموں کے ساتھ ساتھ خارجی اور داخلی موضوعات پر متعدد نظمیں لکھی گئیں۔ اس دور میں لکھی گئی قومی نظمیں اُردو شعری سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ متذکرہ بالا شعراء میں سے اکثر کے مجموعات اشاعت پذیر ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں اور جو شعراء بقید حیات ہیں وہ بڑے انہماک کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ اس بارے میں حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

"اس دور کے شعراء میں دورِاول کے شعراء کی نسبت فنی شعور میں زیادہ

پختگی اور رچاؤ ہے۔ موضوعات میں زیادہ فکری گہرائی ہے۔'' ۱

اس دور کے شاعروں نے اپنے عہد کے مختلف ادبی رجحانات، دبستانوں اور شعری روایات سے متاثر ہو کر مختلف النوع شعری تجربے کئے۔ یہ تجربے ایسے تھے جن سے شعراء کی عصری آگہی اور تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

لیکن روایت اور تقلید کی اندھا دھند پیروی سے انفرادیت کا تحفظ ممکن نہ رہا۔ سیاسی بیداری، سماجی ذمہ داری، وطن پرستی، اقبال کی پیروی اور اشتراکی تصورات کی خوشامدی نے شاعروں کی تخلیقی قوتوں کو ضرر پہنچایا۔ ایسی بہت کم شعری تخلیقات معرضِ وجود میں آئیں جو تجربے، اظہار، لفظ و معنی اور ہیت و موضوع غرض تمام فنی تکمیلیت کے ساتھ ریاست میں اُردو شاعری کو بنیاد فراہم کرنے میں معاون ثابت ہوئیں۔ ساتھ ہی ساتھ شعر و ادب کے ارتقاء میں بزرگ شعراء کی شعری تخلیقات اور ان کے تربیت یافتہ دوسرے وجوان شعراء کی شعری کاوشوں نے اہم رول ادا کیا۔ کئی قابل مطالعہ مجموعے منظرِ عام پر آئے جن میں غلام حسین تنہا کا ''شبنمستان''، نازکی کا ''دیدۂ تر''، نند لال کول کا ''رشحات قلم''، قمر قمر رازی کا ''ارمغانِ کشمیر''، کشن سمیل پوری کا ''فردوس وطن''، رسا جاودانی کا ''نیرنگ غزل'' اور ''نظم ثریا''۔ منوہر لال دل کا ''نقدِ دل''، دینا ناتھ رفیق کا ''سنبل و ریحان''، نند لال کول بے غرض کا ''ترانۂ بے غرض''، غ۔م۔ طاؤس کا ''موج موج''، بلبل کا ''خندۂ گل'' قابلِ قدر اضافے ہیں۔ کلاسیکی روایات کی آبیاری کرنے والے شعراء میں طالب ایمن آبادی، قیصر قلندر، اندر جیت لطف، عرش صہبائی، عابد مناوری، قاضی غلام محمد، شہباز راجوری، منشور بانہالی، نشاط انصاری، رہبر جدید، برج موہن شفق، رشید نازکی وغیرہ شامل ہیں۔ اس دوران کچھ مجموعے ایسے بھی سامنے آئے جو مقبولِ عام ہوئے۔ اندر جیت کا 'بربطِ دل'، عرش صہبائی کا

۱۔۔۔۔۔حامدی کاشمیری۔ اُردو شاعری کے نئے رجحانات۔ ہمارا ادب۔ کلچرل اکادمی

'شکستِ جام' اور 'شگفتِ گل' اور 'صلیب'، عابد مناوری کا 'بہارِ غزل' اور 'شمیمِ گل'، 'اے جنتِ کشمیر'، رہبر جدید کا 'خیاباں'، 'طلوع جام' اور 'حریمِ ناز' کلاسیکی شاعری کی روایات کی عکاسی کرتے ہیں۔ قاضی غلام محمد کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ 'حرفِ شیریں' دلچسپ اور بامقصد شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔

آزادی کے بعد کا دور سیاسی افراتفری اور کشمکش کا دور رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سماجی اور معاشی شکست وریخت ہو چکی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ سماجی اور معاشی تعمیر نو کو فروغ دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں گوناگوں مسائل نے جنم لیا۔ نوجوانوں کو تہذیب وثقافت اور شعر وادب کی طرف متوجہ کرنے کے سلسلے میں تمام ذرائع اختیار کرنے کی کوشش کی گئی اور Progressive Writers Association کا قیام عمل میں لایا گیا۔ شعراء نے نئی کروٹ لی اور سوچ کے زاوے میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔

نئے شعراء تقسیم وطن کے مروجہ شعری رجحانات مثلاً فطرت نگاری، انقلابیت، وطنیت، اقبال پسندی، خارجیت اور مقصدیت سے انحراف کر کے داخلیت پسندی، دروں بینی اور علامت نگاری کی جانب راغب ہوئے۔ نئے افکار وخیالات نے ریاستی شعراء کو بھی متاثر کیا اور وہ ایک نئے تناظر میں شخصی، ملکی اور لسانی مسائل کو دیکھنے لگے۔ اس نمایاں شعری تبدیلی کے بارے میں حامدی صاحب لکھتے ہیں:

> "۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک ریاست میں اُردو شاعری ایک نئے موڑ پر آئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ملکی سطح پر شعراء اور ادباء کے ذہنی رویوں میں انقلاب خیز تبدیلی نمودار ہونے لگی۔"[1]

یہی انقلاب انگیز تبدیلی جدیدیت کا نقطۂ آغاز تھا۔ بین الاقوامی سطح پر سیاسی،

[1] ...... حامدی کاشمیری۔ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ادب۔ ص۔ ۶۷

سائنسی اور فکری انقلابات کے نتیجے میں ملک کے ذہنی اور تہذیبی ڈھانچے میں بھی اہم اور نتیجہ خیز تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں۔ بیسویں صدی میں میکانکی اور صنعتی ترقی نے ہندوستان کے سماجی، تہذیبی اور ذہنی مزاج کو بھی متاثر کیا۔

۱۹۶۰ء کے بعد ملک گیر پیمانے پر ادب میں نئے موضوعات، تصورات اور نئی تحریکوں نے نئے انداز سے اُبھرنا شروع کیا۔ ملک بھر کے شعراء و ادباء نئی سمتوں اور نئے راستوں کی تلاش میں لگ گئے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں ریاست کا اُردو شاعر ان نئی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ سستی جذباتیت اور کھوکھلے نعروں کا دور ختم ہو چکا تھا۔ نتیجتاً یہاں کے اُردو شعراء براہِ راست ان نئے تقاضوں کا اثر قبول کرتے گئے۔

تیسرے دور کے شعراء نے جدیدیت کو ہی شعار بنا کر عصری شعری منظر نامہ پیش کیا۔ کلاسیکی روایات سے انحراف کر کے نئے افکار و خیالات کے ساتھ بدلتے عہد کی ترجمانی کی۔ انہوں نے تراکیب کی تراش خراش، لب و لہجہ کی تبدیلی کے ساتھ نئے شعری تجربوں کے ذریعے اُردو کے شعری اُفق پر تابناکیاں بکھیر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دور ریاستی شعری سفر کا تابناک دور کہلایا۔ اس دور میں جو شعراء سامنے آئے وہ نہ صرف ریاستی سطح پر سراہے گئے بلکہ قومی سطح پر بھی قارئین کے دائرۂ فکر و نظر میں آئے۔ انہوں نے قومی سطح پر ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر نئے شعراء کے افکار و خیالات سے ہم آہنگ ہو کر براہِ راست ان کا اثر قبول کیا اور جدیدیت کے زیر اثر حیات و کائنات کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے لگے۔

تیسرے دور کے اکثر شعراء کے مجموعے چھپ چکے ہیں اور ان کی شعری کاوشوں کو سراہا گیا ہے۔ ان کی تازہ ترین تخلیقات معیاری رسائل جیسے 'شب خون'، 'شاعر' کے علاوہ غیر ملکی جرائد ورسائل میں اشاعت پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ ان شعراء میں حکیم منظور، حامدی کاشمیری، قاضی غلام محمد، مظفر ایرج، ہمدم کاشمیری، عابد مناوری،

شبیب رضوی، سلطان الحق شہیدی، فاروق نازکی، پرتپال سنگھ بے تاب، شجاع سلطان، فاروق مضطراور رفیق راز شامل ہیں۔

ہر نئے عہد میں بدلتے ہوئے حالات کے تحت ایک نئے شعری مزاج کی تشکیل ہوتی ہے اوراس شعری مزاج کی عکس نمائی اس عہد کی شعری تخلیقات سے ہوتی ہے۔ شاعر چونکہ حساس ہوتا ہے اسلئے خارجی حالات کے دباؤ کے تحت اس کے ذہنی رویئے داخلی تپش کی آنچ میں تپ کر شعری تخلیق میں متشکل ہوتے ہیں اور یہی عمل نئے رجحانات کی نمود کا باعث بنتا ہے۔ انہی رجحانات سے واقفیت رکھنے والا اورانکی نمائندگی کرنے والا شاعر صحیح معنوں میں عصری شعور کا نمائندہ کہلاتا ہے۔

ریاستی سطح کا موجودہ شاعر اپنی ذات اور عہد کا بھرپور شعور رکھتا ہے۔ موجودہ انتشار نے اس کے اندر مایوسی، بے یقینی، فریب، شکستگی کی کیفیات پیدا کردی ہے اور ہجوم میں تنہائی کی وجہ سے اپنے ہی خول میں سمٹنے کا ڈر اسکوستا تا رہتا ہے۔ عصری آگہی کے رجحان نے شاعری میں شدید داخلیت کے عنصر کو داخل کیا ہے۔ یہ داخلیت فنکار کے شخصی کرب، نفسیاتی کشمکش اور لاشعوری تجربات میں متشکل ہوتی ہے۔ جدید آہنگ کے ساتھ عصری آگاہی کے اظہار کیلئے شعراء نے لفظیات، تراکیب اور تلازمات کو علامتی پیرائیہ میں استعمال کرکے اشاراتی مفاہیم پیدا کیئے۔ اکثر شعراء نے انفرادی تخلیقی ہنرمندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس بارے میں منیب الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

> ”ریاست کا ہر نمائندہ شاعر کا اسلوبِ اظہار منفرد ہے۔ ریاست کے نوجوان شعراء تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ نئی حسیّت اور عصری آگہی کا اظہار ان کے اشعار میں زبان و بیان کے نئے پن اور لہجے کی تازگی کے ساتھ فنی تنظیم اور دیگر نزاکتوں کے شعور کے ساتھ ہوتا ہے۔“[1]

[1] ...... منیب الرحمٰن۔ مضمون۔ ریاست کی نئی اُردو شاعری۔ رسالہ تعمیر۔ ص ۱۰۵

کلاسیکی روایات سے انحراف کر کے نئے شعراء نے نئے ذہن کے ساتھ اپنے عہد کی ترجمانی کر کے عصری آگاہی کا ثبوت پیش کیا۔ نئے شعری رجحانات اور تراکیب کے ذریعے انہوں نے تخلیقی صلاحیتوں اور منفرد اسلوب کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ داخلیت پسندی کے رجحان کے ساتھ ان کا تخیل نئے شعری اُفق کو چھونے لگا اور وہ جدیدیت کے تحت بنیادی طور پر انسانی اقدار کی پامالی اور بے حرمتی کے دلدوز مناظر کے نوحہ خواں بن گئے۔ وہ اپنے پر آشوب عہد کی علامتی پیکر تراشی میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس طرح کے شعراء میں سب سے بڑا نام حکیم منظور کا ہے۔ جن کے اشعار میں نئے شعری مزاج کا تشخص، فکر کا تنوع، عصری آگہی، اسلوب کی جدت کے ساتھ ساتھ روایت شکنی کا رویہ شدت سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کے ہاں لفظوں کے کھردرے پن میں بھی معنویت کی کئی تہیں پوشیدہ ہیں۔ اس دور (تیسرے دور) کے اولین شعراء میں حکیم منظور کا قد اونچا اور کلام تمام تر شعری نزاکتوں سے مزیّن نظر آتا ہے۔ وہ ایک نئی آواز کے ساتھ اُردو شعری دنیا میں ظہور پذیر ہوئے۔ اُن کی شعری ونثری تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں۔ صحافت کے میدان میں بھی وہ گراں قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ نئی شاعری کے سلسلے میں اولیت کا درجہ حکیم منظور کو حاصل ہے۔

منیب الرحمٰن حکیم منظور کے بجائے حامدی کاشمیری کو اس ضمن میں اولیت کا درجہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نئی شاعری کے سلسلے میں حامدی کاشمیری نے پیش رفت کی۔ روایتی اور رومانی شاعری سے کنارہ کش ہو کر انہوں نے موضوع اور اسلوب کو بیجا جکڑ بندیوں سے آزاد کرا کے نئے شعری تقاضوں کے مطابق کر دیا۔''[1]

---

[1] ......منیب الرحمٰن۔تعبیر۔جموں وکشمیر میں اُردو نمبر۔ص ۹۸ (محکمہ اطلاعات ریاست جے اینڈ کے)

حامدی صاحب ریاست میں نئی شاعری کے پیش رو ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے شاعروں کی ایک فہرست یوں ترتیب دیتے ہیں:

"نئے شعراء میں راقم کے علاوہ حکیم منظور، خالد بشیر، رفیق راز، اقبال فہیم، مسعود سامون، منیب الرحمٰن، اشرف ساحل، شہباز راجوری، مظفر ایرج، شجاع سلطان، فاروق مضطر، محمد یاسین، پرتپال سنگھ بے تاب، فاروق آفاق، رخسانہ جبیں، احمد شناس، رفیق راز اور جاوید آذر شامل ہیں۔"[1]

نئی شعری حسیّت کی ترجمانی کے سلسلے میں مرحوم منظر اعظمی صاحب لکھتے ہیں:

"جنہوں نے کلاسیکی روایات سے انحراف اور نئے ذہن، نئے عہد اور نئی شعری حسیّت کی ترجمانی کی، انہوں نے نئی تراکیب کی تراش خراش اپنے عہد کی زبان اور حیاتی شعری تجربوں کے ذریعے اُردو کے شعری اُفق کیلئے دریچے پیدا کئے۔ اس طرح کے شعراء میں سب سے بڑا نام حکیم منظور کا ہے۔"[2]

مختصراً اس دور کی شاعری کے مطالعے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ بیک وقت دونوں شعراء حضرات (حکیم منظور اور حامدی کاشمیری) نے اُردو شاعری کو نیا مزاج، رنگ و آہنگ اور صورت وصدا بخشنے میں جو پہل کی وہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مظہر امام کی ماہرانہ رائے ہے:

"وہ (حکیم منظور) عمر میں حامدی کاشمیری سے چھوٹے ہیں لیکن جہاں تک نئے مزاج کو قبول کرنے کا سوال ہے حکیم منظور اور حامدی کاشمیری ہم عمر ہیں۔"[3]

۱..... حامدی کاشمیری۔ ریاست جموں و کشمیر میں اُردو ادب۔ گلشن پبلشرز، سرینگر۔ ص۔ ۷۷

۲..... ڈاکٹر منظر اعظمی۔ جموں و کشمیر میں اردو ادب کی تاریخ۔ رسالہ تعمیر (محکمہ اطلاعات جے اینڈ کے)

۳..... مظہر امام۔ جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نئی نسل کے امکانات۔ (مضمون) رسالہ۔ تعمیر محکمہ اطلاعات

حکیم منظور نے نئے آہنگ، نئے لب و لہجے اور جدید طرزِ اظہار کے ساتھ ریاستی شعری قافلے کی رہنمائی کی۔ ان کی شاعری کا پس منظر اُن کے ادراک کو توانائی اور اظہار کو استناد عطا کرتا ہے۔ ان کی غزلوں میں اظہار کو موثر بنا دینے والی فکر و احساس کی تازگی اور اجنبیت نمایاں ہے۔ مقامی رنگ و آہنگ لئے استفہامیہ اندازِ بیان کے ساتھ وصفی تراکیب اور علامتوں کا خوبصورت امتزاج ان کی شاعری کو فکر و معنی کی نئی جہتوں سے ہمکنار کرتا ہے وہ نامانوس لفظیات، اَن چھوئے پیکروں کے استعمال کے باوجود تازہ کاری کا احساس دلاتے ہیں۔ حکیم منظور برصغیر کے اہم شاعر کی حیثیت سے اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔

نئی شاعری کے سلسلے میں جسکی ابتداء ۱۹۶۵ء کے بعد ہوئی۔ حامدی کاشمیری نے جدید اسلوب اور رنگ و آہنگ کے ساتھ نئی جہت تو عطا کی۔ ساتھ ہی اُن کے موضوعات عصری تقاضوں کے پیش نظر زیادہ پیچیدہ اور تہہ دار ہو گئے۔ وہ اپنے کلام میں طلسمی صورت حال تخلیق کرنے کے قائل ہیں اور اس شعری انفرادیت کو کامیابی سے برتتے ہیں۔ وہ پیکر تراشی اور استعاراتی اظہار کے روادار ہیں۔ مثلاً برف، وادی، پہاڑ، سنگ، شجر، سایہ، شعلہ، آسیب، دشت وغیرہ الفاظ ان کی شاعری میں استعاراتی نظام قائم کرتے ہیں۔ اُن کے اشعار ان کے مخصوص شعری رجحان اور فکر و احساس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ معنی الفاظ میں پوشیدہ نہیں ہوتے بلکہ اُس طلسمی فضا کے زائیدہ ہوتے ہیں جو وہ اپنے شعروں میں تخلیق کرنے کے روادار ہیں۔ عصری ماحول، زندگی کی بے معنویت، لاحاصلی اور بنجرپن کا احساس ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ عصری انسانی پیچیدگیوں کا اظہار وہ مختلف طریقوں سے کرتے ہیں جس سے اُن کے اشعار میں معنی خیز فضا تخلیق ہوتی ہے۔

غلام نبی ناظر حامدی صاحب کے شاعرانہ رنگ پر تبصرہ کرتے ہیں:

"ان کی (حامدی کاشمیری) شاعری کلاسیکی رکھ رکھاؤ کے ساتھ جدید

حسیّت اور عصری آگہی اور وسعتِ مشاہدہ، فکری تنوع اور جدتِ اسلوب سے مزّین ہے ان کی زبان اور تراکیب اور علامات واستعارات کا جدید استعمال ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ عطا کرتے ہیں۔''[1]

حامدی صاحب اپنے دور کی تشنہ سامانیوں اور کربناکیوں کا بھرپور احساس رکھتے ہیں۔

گر گیا خون بے گناہوں کا
بڑھ گئی اشتہا زمینوں کی

کامیاب نظموں کے خالق حامدی صاحب ہمیشہ اپنی انفرادیت کا تحفظ کرتے ہیں۔ انہوں نے تحقیقی، تنقیدی اور شعری تخلیقات کے ذریعے اُردو شعر وادب کے دامن کو مالامال کیا ہے۔

اُردو شعری اُفق پر ایک اور نام قاضی غلام محمد کا ہے۔ اُن کے کلام کو زندگی اور زندہ دلی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ اُردو کے ساتھ ساتھ کشمیری میں بھی اظہار خیال کرتے ہیں اور ایک حساس فنکار کی طرح گردوپیش کے حالات کا اثر قبول کرتے ہیں۔ وہ اپنے من کی بات قاری تک پہنچانے میں مزاحیہ انداز کا سہارا لیتے ہیں جو پر لطف ہونے کے ساتھ ساتھ زود اثر بھی ہے۔ قاضی صاحب فطرتی شاعر ہیں۔ وہ فطرت کے رنگوں سے کھیلتے ہوئے بات میں بات پیدا کرتے ہیں اور یہیں سے بے لوث اور اچھوتے شعری افکار کی تخلیق ہوتی ہے۔ قاضی صاحب کو پیٹروی لکھنے میں یدطولیٰ حاصل ہے۔ سید محی الدین قادری زوران کے کلام کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انکا سنجیدہ کلام قدیم اور جدید اسالیب سخن کے امتزاج سے معمور ہے جو فطرتی اور بے لوث شاعر ہی کے موئے قلم کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔''[2]

[1]۔۔۔۔۔غلام نبی ناظر۔ کشمیر میں اُردو شاعری کے پچاس سال۔ مضمون۔ شیرازہ ص۔۱۳۶۔ ریاستی کلچرل اکادمی

[2]۔۔۔۔۔سید محی الدین قادری زوؔر۔ تعارف۔ حرف شیرین۔ مجموعہ کلام۔ قاضی غلام محمد

وادی کی شگفتہ زمین سے گہری وابستگی رکھنے والوں میں مظفر ایرج کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے پُر اعتماد تخلیقی قوتوں کا بھرپور اظہار کر رہے ہیں۔ اُنکے شعری مجموعات کو ادبی حلقوں میں سراہا گیا ہے۔ اُنکی شاعری میں صوفیانہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔ جو اُن کی شخصیت کی تکمیلیت کا پتہ دیتا ہے۔ وہ اظہارِ ذات ایک سچے جذبے کے تحت کرتے ہیں اسلیئے اُن کے شاعرانہ لہجے کو طمانیت عطا ہوتی ہے۔ انسانی اقدار کی شکست وریخت کا کرب انکے اشعار میں جھلکتا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

شعلہ شعلہ صنوبروں میں اُتار　　　پھر مجھے سوکھے جنگلوں میں اُتار

غزلوں کے علاوہ انہوں نے نظمیں بھی لکھیں اور نظم کو نئی جہت عطا کرنے میں وہ کامیاب رہے ہیں۔ اُن کی شعری دنیا غیر مانوس نہیں لگتی اور یہ کامیاب شاعر کی دلیل ہے۔ اکثر نظموں کی لفظی اور صوتی آہنگ کا احساس قاری کو اطمینان وسکون بخشتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

"نظم اور غزل دونوں میں مظفر ایرج نے انفرادیت سے کام لیا ہے اور اپنے لہجے کی شناخت کو طمانیت بخشی ہے۔"[1]

مظفر ایرج کا ایک کامیاب تجربہ آزاد غزل کا تھا۔ صنف کوئی بھی ہو انفرادیت کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ جہاں ایرج غزل کے مزاج سے بخوبی واقف ہیں وہاں نظم کی تکنیک کے بھی ماہر نظر آتے ہیں۔

"ریاست جموں وکشمیر میں آزاد غزل کہنے کی پہلی کوشش مظفر ایرج نے کی۔ نظموں میں اسلامی اساطیر اور تلمیحات کے استعمال سے ان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ ان کی نظموں میں ایک عمودی ارتقاء ملتا ہے۔ نظم کی تکنیک کو وہ فنی چابکدستی سے برتتے ہیں۔"[2]

---

[1]..... غلام نبی ناظر۔ کشمیر میں اُردو شاعری کے پچاس سال۔ ص۔ ۱۴۳۔ شیرازہ ریاستی کلچرل اکادمی

[2]..... مظہر امام۔ جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نئی نسل کے امکانات۔ تعمیر۔ محکمہ اطلاعات۔ ص۔ ۱۲۰

حکیم منظور کے مطابق مظفر ایرج کی نظموں کی فضا، ادا اور اسلوب مروجہ نظموں سے مختلف ہے۔ وہ مظفر ایرج کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:۔

"ایرج جداگانہ ذہن رکھتے ہیں۔ فرسودہ رنگ اور روش اُن کے ذہن اور مزاج سے میل نہیں کھاتے اور یہ کہ وہ پامال راستوں پر سفر کرنے کے روادار نہیں۔"[1]

روایت کی پاسداری کرنے والوں میں ہمدم کاشمیری کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن کا اصلی نام عبدالقیوم خان ہے۔ انہوں نے اپنی اظہار ذات کیلئے نظم اور غزل دونوں اصناف کا سہارا لیا ہے۔ غزل سے انہیں فطری لگاؤ تو ہے ساتھ ہی نظموں کے ذریعے اسلوب میں نیاپن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ روایتی ڈگر ہی پر چل کر وہ غزل میں نت نئے اسالیب کو سمونے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

یہ فقط سوزِ تمنا کا صلہ ہے اے دوست
تیرگی میں بھی ہے روشن مرا کاشانۂ دل

ریاستی شعری اُفق پر ایک تابناکی کے ساتھ عابد مناوری کا نام روشن نظر آتا ہے۔ ان کا اصلی نام گوری نندن سنگھ بالی ہے لیکن دنیائے شعر میں عابد مناوری کے نام سے مشہور ہیں۔ جوش ملسیانی سے تلمذّ حاصل کر کے ریاستی سطح پر استادی کا رتبہ پایا۔ زبان کے نکات اور شعری اسالیب پر قدرت حاصل کر لی۔ غزلوں کے علاوہ انہوں نے نظمیں، قطعات، رباعیات اور دوہے بھی لکھے ہیں۔ غزل بڑی منجھی ہوئی کہتے ہیں۔ خاص کر چھوٹی بحروں کو خوبی کے ساتھ برتتے ہیں۔ ان کے تغزل میں بھی حسن و عشق کی وارداتوں کے رمزیہ انداز میں زندگی کے مسائل کا عرفان جھلکتا ہے اور اکثر نظموں پر غزل کا انداز اور رومانی فضا چھائی ہوئی ہے۔ قطعات میں بھی یہ

[1]...... حکیم منظور۔ سرورق۔ ابجد (مجموعہ شعر) مظفر ایرج

فضا اور رنگ نمایاں ہے اور مختلف سماجی تضاد کی طرف واضح اشارات ملتے ہیں۔ وہ روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ جدید ذہنی اُپج کا بھرپور احساس رکھتے ہیں اور ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ عبدالقادر سروری ان کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''غزل کی روایت کی وفاداری کے ساتھ پابند ہوتے ہوئے بھی، اپنے عہد کے اور نظر بصیرت رکھنے والے شاعروں کی طرح وہ نئی فکر، نئے اُفق اور اسالیب کے اثر سے بیگانہ نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ ان کی غزل ان دونوں رجحانات کا دلکش سنگم بن چکی ہے۔''[۱]

عابد غزل کے فن اور اسالیب پر استادانہ قدرت رکھتے ہیں۔ وہ شعری مزاج کو نیا رنگ و آہنگ دینے میں کامیاب رہے ہے، اخلاقی اقدار اور کائناتی حقائق، انکشافِ ذات، فطرت کی نیرنگیوں کو اپنے کلام میں کہیں واضح اور کہیں رمزیہ پیرائیہ میں بیان کرنا عابد کا خاصا ہے۔ اُن کا جتنا کلام (مطبوعہ یا غیر مطبوعہ) ہے اس کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عابد کو اردو شاعری کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوا ہے۔ نمونۂ کلام:

میرے آنگن میں اے قوس قزح اِک دن اُتر
زندگی میں تیرا اِک اِک رنگ بھرنا ہے مجھے

ریاستی شعری کینواس کو خوشنما رنگوں سے سجا کر یہ خوش فکر شاعر اپنی کئی شعری تخلیقات بطور یادگار چھوڑ گیا ہے۔

شبیب رضوی مستقل ریاستی باشندہ نہ ہونے کے باوجود بھی یہاں کے ماحول، یہاں کی زبان اور شعری فضا کی بھرپور علمیت رکھتے ہیں۔ اُنکا تعلق اُتر پردیش سے ہے مگر ازدواجی زندگی کے بندھن نے انہیں کشمیر کی سرحدوں ہی میں جکڑ دیا۔ مادری زبان کے ناطے اُردو زبان پر انہیں بھرپور دسترس حاصل ہے۔

عصری شعور کی بیداری کے ساتھ ہی ساتھ اُن کے کلام میں جگہ جگہ نئے تصورات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ شبیب رضوی قطعی طور پر روایت سے منحرف نہیں ہیں۔ قدم قدم پر اُن کا تخلیقی کاوشوں میں کوئی معتبر آواز سنائی دیتی ہے اور یہ احساس دور تک قاری کا تعاقب کرتا نظر آتا ہے۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ وہ نعت اور مرثیے بھی لکھتے ہیں اور اپنے کلام میں جداگانہ رنگ پیدا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ نمونۂ کلام:

دھوپ کے شہر میں جسموں کو چرائے رکھیو
اپنے ہمراہ فقط جسم کے سائے رکھیو

سلطان الحق شہیدی ریاستی سطح کا ایک کہنہ مشق شاعر ہے۔ روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ نئے شعری رجحانات سے بھی گہری واقفیت رکھتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں عصری شعور بیدار نظر آتا ہے اور کلام میں فکر و خیال کا نیاپن ہے۔ تاہم روایتی انداز بیان سے دامن چھڑانا کبھی کبھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ نعت گوئی میں شہیدی ایک منفرد انداز کے مالک ہیں۔

فاروق نازکی کی متنوع شخصیت ایک حساس فنکار کی طرح اُن کے کلام میں جھلکتی ہے۔ ابتدائی کلام میں رومانوی انداز کا غلبہ رہا۔ اُن کے کلام میں فیض احمد فیض کے اثرات بہ آسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ چھوٹی بحروں کو برتنے میں اُن کی غزلوں میں شدتِ تاثر شدید نظر آتا ہے۔ نازکی کی غزلوں میں کلاسکیت سے زیادہ اپنے عہد کے اسالیب و مسائل ہیں۔ پر آشوب سماجی زندگی، ظلم و بربریت اور انسانی رشتوں کی پامالی کے اظہار کو وہ نہایت صدق دلی سے اپنے شعری کینواس پر اتارنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ عصری انتشار اُن کے شعری ذہن کو غذا فراہم کرتا ہے۔ منفرد غزلوں کے ساتھ ساتھ نازکی خوبصورت نظموں کے خالق بھی

1 ...... عبدالقادر سروری۔ کشمیر میں اُردو۔ حصہ دوم۔ ص۔ ۱۳۵

ہیں۔ وہ موجودہ سماجی مسائل کو نظم کی تکنیک اور علامتوں کے پیرائیہ میں ماہرانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں عصری، درد و کرب کے ساتھ ساتھ ڈرامائی پس منظر ابھر کر سامنے آتا ہے جو کامیابی کی دلیل ہے۔ اُن کی متعدد نظموں میں معاصرِ فکر اور حسیّت کا اظہار بہتر تخلیقی سطح پر ہوا ہے

فاروق نازکی نے آزاد غزلیں بھی کہی ہیں۔ ریاست میں آزاد غزل کہنے کی پہلی کوشش مظفر ایرج کے بعد فاروق نازکی نے کی۔ فاروق کے شاعرانہ لہجے کا تنوع، اندازِ بیان کی جدت انہیں بڑے شاعروں کی صف میں شامل کرتا ہے۔ اُن کی شاعرانہ مہارت پر غلام نبی ناظر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ (فاروق نازکی) اپنے جذبِ دروں کو لطف و انبساط کی شدت کی آنچ دے کر غزل کے رنگ میں ایک دلکش اور پر کیف انداز میں پیش کرنے کی مہارت رکھتے ہیں۔''[1]

نمونۂ کلام:

شہر کے ہنگاموں میں کھو جاتا ہے اکثر میرا چہرہ
تنہائی کے تاج محل میں میرا چہرہ درپن درپن

پرتپال سنگھ بےتاب کا نام موجودہ دور کے کامیاب شعراء کی صف میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے عہد بہ عہد زندگی کے بدلتے رنگوں سے آشنائی حاصل کی اور اپنے شعری منظر نامے کے وسیع کینوس کو اس کے بھرپور رنگوں سے سجاتے رہے۔ غزلوں کے علاوہ وہ نظمیں بھی لکھتے ہیں اور ابھی بھی پورے انہماک کیساتھ گیسوئے شعر سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اکثر نظموں میں منظر کشی کے دوران وہ مصورانہ اندازِ بیان اپناتے ہیں لیکن غزلوں میں اُن کا لہجہ زیادہ صاف اور منجھا ہوا ہے۔ شعری کاوشوں کے نتیجے میں کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بےتاب وقت کی

[1] ...... غلام نبی ناظر۔ شیرازہ۔ کلچرل اکادمی جے اینڈ کے۔ مضمون 'کشمیر میں اردو شاعری کے پچاس سال'۔ ص۔ ۱۳۵

بدلتی کروٹوں کا احساس رکھتے ہیں اور سماجی اقدار کی شکست و ریخت کے ساتھ ساتھ آشوب زدہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو فنی تکنیک کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ مایوسی، مجبوری اور برہمی ان کی شاعری میں اکثر دیکھنے کو ملتی ہے لیکن اُن کی شاعری زندگی سے بھرپور ہے۔ یہ اُن کے کامیاب شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ نمونۂ کلام:

گھر سے مجھے نکال کے خوش ہو گیا تھا وہ
میں تو مگر بسا ہوا پورے نگر میں تھا

ماہر لسانیات منیب الرحمٰن پرتپال سنگھ بے تاب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

پرتپال سنگھ بے تاب بھی منفرد اسلوبِ شعر کی بشارت اپنی نظموں اور غزلوں میں الگ الگ طور پر دیتے ہیں۔ اُن کے مجموعہ کلام ''پیش خیمہ'' سے ظاہر ہے کہ وہ الفاظ کی نئی معنوی جہتیں اپنے تجربات اور احساسات کے تناظر میں تلاش کرتے ہیں۔''[1]

شجاع سلطان نے ترسیل ذات کیلئے شاعری کے علاوہ مصوری کا پیشہ بھی چنا ہے۔ اپنی شاعری میں وہ خوابوں کی دنیا ضرور سجاتے ہیں لیکن حقیقی دنیا کی کشمکش سے بالکل بھی نا آشنا نہیں ہیں۔ رشتوں کی بڑھتی ہوئی بے معنویت نے انسانی اقدار کو مسمار کر دیا ہے۔ جسکے نتیجے میں آج کا حساس فرد کرب میں مبتلا ہو چکا ہے۔ شجاع سلطان نے فرد کے اسی کرب کے احساس کو شعری زبان عطا کی ہے اور اس تجربے میں وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ اقدار و عقائد کا کھوکھلا پن ان کی غزلوں میں مختلف لفظ و پیکر میں اظہار پاتا ہے۔ ان کے کلام میں لچیلا پن ہے اور زبان میں پیچیدگی کے بجائے وسعت ملتی ہے۔ وہ مبہم استعارات سے ہمیشہ دامن بچاتے نظر آتے ہیں۔ ایک کامیاب شاعر کی طرح اشعار کے تخلیقی عمل کے دوران وہ اپنے

[1]...... منیب الرحمٰن۔ رسالہ۔ تعمیر۔ محکمہ اطلاعات۔ جموں و کشمیر اُردو ادب نمبر۔ ریاست کی نئی اُردو شاعری۔ ص۔ ۱۱۰

تجربات کو سچے جذبوں کی آنچ کی تپش سے نئی آب وتاب عطا کر دیتے ہیں۔ منیب الرحمٰن اُن کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

”شجاع سلطان کی شاعری کی ایک خصوصیت فکر و جذبہ اور لفظ و آہنگ کی وحدت اور ہم آہنگی ہے۔ اُن کے اشعار میں غیر ضروری الفاظ یا خیالات کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ یہ خصوصیت اس وجہ سے آئی ہے کہ وہ اپنے احساسات اور تجربات کا براہِ راست اظہار نہیں کرتے بلکہ اُن کو تخلیقی عمل کی میزان سے گزار کر ہی سامنے لاتے ہیں۔“[1]

نمونۂ کلام:

زمانہ بیت گیا راستوں نے سوچا تھا
وہ آئے گا تو کچھ اک سنگ ہی ہٹا دے گا

اُسی کے ذکر سے روشن ہیں بام و در اپنے
اگر سنے گا تو سب روشنی بجھا دے گا

رفیق راز منفرد اسلوب و آہنگ کے ساتھ ریاستی شعری اُفق پر ابھرے۔ کشمیری اور اُردو دونوں زبانوں میں اپنی ذات کی کربناکیوں، بے چینیوں اور زمانے کے بدلتے رجحانات، قدروں کی شکست وریخت اور غیر یقینیت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ سہمے ہوئے سکوت کی چھکار کا ذکر کر کے وہ اپنا ایک اچھوتا اور متنوع شعری منظر نامے کی تخلیق کرتے ہیں۔ ابتدائی کلام میں پیچیدہ پیکر تراشی اور فارسی تراکیب کے غالب استعمال سے اُن کا رجحان مشکل پسندی کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ رفیق راز کی لفظیات کا دائرہ وسیع ہے۔ الفاظ کا استعمال اُن کی شاعری میں

[1]..... منیب الرحمٰن۔ ریاست کی نئی اُردو شاعری۔ رسالہ۔ تعمیر۔ جموں و کشمیر میں اُردو ادب نمبر۔ ص۔ ۱۰۶

نئے تلازمات پیدا کرتا ہے۔ ان کی شاعری متضاد علامتی پیکروں کا اجتماع ہے۔ شعری ارتکاز ان کے شعروں کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ تجربات کی تہہ داری ان کی غزلوں کو معنویت عطا کرتی ہے۔ ان کے شعری اسلوب کی نشاندہی یوں ہوسکتی ہے۔

یہیں پہ ہم نے بجھائے تھے آفتاب کئی
یہیں پہ ہوگا ہمارا بھی خاتمہ بابا
چاروں اور کے نظر شعلہ شعلہ ہیں
بیچ میں گم صم دھواں دھواں ہے میری سوچ

محمد یاسین بیگ کا شعری سفر سست رفتار ہی رہا۔ وہ اپنی غزلوں میں متوازن زبان استعمال کرنے کے روادار ہیں۔ مختصر نظموں میں بھی متاثر کن طرزِ اظہار ملتا ہے۔ ساتھ ہی عصری آگہی کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔

زمانے کے تغیرات کے ساتھ ساتھ شعر وادب کے مزاج لفظیات، اسالیب، رجحانات اور ذوقِ شعر سب میں تبدیلی واقع ہونا ایک فطری عمل ہے۔ یہ عمل ایک نامحسوس طریقے پر مدتوں پر محیط ہوتا ہے۔ تخلیقی کاوشوں میں نئے تجربات کر کے نیا حسن پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نئی تحریکوں کے ذریعے ادب کو جدت بخشی جاتی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد ہی روایت پرستی سے انحراف کی کامیاب کوششیں کی گئیں اور شعر وادب کو حقیقت سے ہمکنار کر کے نئی جہتوں سے روشناس کیا گیا۔ اس تحریک نے ایک آفاقی صورت حال اختیار کرلی۔ جسکا سامنا ریاستی فنکار خلوص، آگہی اور صداقت کے ساتھ کر رہے ہیں۔ ریاست میں اردو شاعری میں نئے تہذیبی تصورات، فکری میلانات اور عصری رجحانات کے اظہار پر غور وفکر کیا جارہا ہے۔ نت نئے تجربات کے ذریعے اپنے بیدار ذہن کا ثبوت بھی پیش کر رہے ہیں۔ صرف ملکی سطح پر ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر نفسیاتی اور تہذیبی

زندگی میں جو تبدیلیاں آ رہی ہیں، ریاستی شعری مزاج پر اسکی گہری چھاپ دکھائی دے رہی ہے۔ موجودہ دور کا شاعر خاص طور سے انسانی اقدار کی پامالی اور بے حرمتی کے دلدوز مناظر کا نوحہ خواں بن گیا۔ پورا شعری منظر نامہ لہولہو نظر آنے لگا ہے۔ لگ بھگ پچھلی دو دہائیوں کے خون خرابے نے شاعر کے شعری ذہن کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے۔ جسکی گہری چھاپ اُن کی شعری کاوشوں میں نظر آتی ہے۔ عصری تقاضوں سے باخبر موجودہ دور کا شاعر اپنے پر آشوب عہد کی علامتی پیکر تراشی میں مصروف نظر آ رہا ہے۔

> "ہر عہد کا اپنا شعری کردار ہوتا ہے اور وہ اپنے شعری تجربات کی بناء پر اس کے اسالیب متعین ہوتے ہیں۔ نئی شاعری علامت اور استعارے کی شاعری ہے جو نہ صرف زیر لبی کی قائل ہے بلکہ پرچھائیوں سے دیکھی جاسکتی ہے۔"[1]

شاعری مختلف وقتوں میں مختلف مراحل سے گزر کر نئی جہتوں کا سامنا کرتی ہے۔ نیا شاعر نئی علامتوں اور استعاروں کی تلاش میں ہے۔ اس کی شاعری کا نیا استعاراتی کردار اور بے ہیئتی ابہام کبھی کبھی مشکل پسندی کو راہ دیتا ہے۔ آج کا غالب شعری رجحان یہ ہے کہ شاعر خارجی یا داخلی زندگی کی مانوس اور موجود اشیاء یا تصورات کی عکاسی کرنے کے بجائے شخصی سطح پر حسیاتی تجربات کی پیکر تراشی کرتا ہے۔ حامدی کاشمیری نئی شاعری کے لسانی ڈھانچے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "نئی شاعری میں مروّجہ لسانی ڈھانچوں کی شکست و ریخت کا عمل دو سطحوں سے جاری ہے اول لفظیات اور اسالیب کی تشکیلِ نو میں اعتدال پسندی کا رویہ جو محمد علوی، کمار پاشی، شہریار اور شمس الرحمٰن کے یہاں ملتا ہے۔ دوم روایت سے شدید انحراف کا عمل

[1] ...... حامدی کاشمیری۔ اُردو شاعری کے نئے رجحانات (ریاست جموں و کشمیر میں) ہمارا ادب۔ کلچرل اکادمی۔ ص ۱۱۰۔۱۱۱

جس کے علمبردار افتخار جالب اور احمد ہمیش وغیرہ ہیں۔''[1]

نئی شاعری پر بحث کرتے ہی ریاستی سطح کے چوتھے دور کے شعراء کی لمبی قطار سامنے آتی ہے جن میں کچھ قد آور اور کچھ کم قد آور نظر آتے ہیں لیکن کم وبیش سب کے سب شعری کاوشوں کے ذریعے اپنی تخلیقی قوتوں اور زبان وبیان کی تازگی کا پتہ دیتے ہیں۔ ان شعراء میں نئی جہتوں اور نئے اسالیب اور حالیہ برسوں کی سائنسی اور تکنیکی ترقی کے اثرات اور زبان پر بھرپور دسترس کے نمونے ملتے ہیں۔

مظہر امام نئے شعراء کے بارے میں اظہار خیال یوں کرتے ہیں؛

''اُن میں سے اکثر شعراء کے ہاں تخلیقی اُپج کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کیلئے لگن، ذوق اور ولولہ ہے۔ نئے سے نئے تجربوں کو قبول کرنے اور نئی سے نئی صنف میں اظہارِ خیال کرنے کی شعوری کوشش ریاست کے نئے ادیبوں اور شاعروں میں ملتی ہے۔''[2]

چوتھے دور کے شعراء کو دو گروپوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا گروپ اُن شعراء پر مشتمل ہے جو صاحبِ کتاب ہیں اور بڑے انہماک اور تواتر کے ساتھ لکھتے اور چھپتے رہتے ہیں۔ اِن کی فہرست یوں ہے: اقبال فہیم، اشرف ساحل، فرید پربتی، شہباز راجوری، رخسانہ جبیں، نذیر آزاد، فاروق مضطر، غلام محمد آجر، مسعود ساموں، فاروق آفاق۔ یہ وہ شعراء ہیں جن کا شعری سفر کئی دہائیوں پر مشتمل نظر آتا ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے کچھ نئے رجحانات کا ظہور ہوا اور یہ شعراء اپنی خود آگہی کی روشنی میں اپنے زمانے کا پوری طرح سے شعور رکھتے ہیں اور روایتی تصورات سے

۱...... ہمارا ادب۔ کلچرل اکادمی جموں وکشمیر۔ اُردو شاعری کے نئے رجحانات جموں وکشمیر میں۔ حامدی کاشمیری۔ ص۔۱۱۲

۲...... مظہر امام۔ جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نئی نسل کے امکانات۔ تعمیر۔ محکمہ اطلاعات۔ ص۔۱۲۳

ناامید ہوکر ذاتی کرب و بحران میں پھنس جانے کی وجہ سے ایک طرف ذہنی طور پر اپنے وجود کی گہرائیوں سے بھی آگاہ ہیں۔ دوسری طرف کائنات کے مختلف مظاہر کی حقیقت سے آگاہی چاہتے ہیں اور یہی جذبہ واحساس لے کراُن کی شعری تخلیقات معرضِ وجود میں آتی ہیں۔

اقبال فہیم دونوں اصناف غزل اور نظم میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور منفرد اسلوب کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ اپنی مٹی سے جڑا ہوا یہ شاعر نہ صرف زمینی حقائق کی بھرپور آگہی رکھتا ہے بلکہ پوری آب وتاب کے ساتھ اپنی غزلوں اور نظموں میں برتتا بھی ہے۔ ان کی شاعری میں جو برہمی اور جھلاہٹ کے اثرات نمایاں ہیں وہ براہِ راست سماجی تضادات کے نتائج کے طور پر اُن کے کلام میں در آتے ہیں۔ اُن کے ہاں فکر و تجسس کی تہہ داری بھی ہے۔ اکثر غزلوں اور نظموں میں خوابوں اور حقیقتوں کا ٹکراؤ ملتا ہے۔ ان کی شاعری کسی حساس فنکار کے شاہ پارے کی یاد دلاتی ہے۔ فلسفیانہ اندازِ فکر اُن کی شاعری کو معتبر بناتی ہے اور قارئین کے احاطۂ غور و فکر میں لاتی ہے۔

نمونہ کلام:

وہ جن کے چہرے نہیں روشنی سے بھاگیں گے
میں آئینوں میں رہا ہوں مرا تو چہرہ ہے

اشرف ساحل غزل کے ساتھ ہی ساتھ نظم میں بھی اپنا شعری اظہار کرتے رہے۔ ماورائیت ان کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ لطیف اور نازک پیکروں کے ذریعے وہ اپنی شاعری کو رومانیت کے قریب تر کر لیتے ہیں۔ وہ پوری فنی اور تخلیقی قدرت کے ساتھ کسی تجربے کو شعری پیرائے میں اتارنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کی شاعری انتشارِ ذات کے اظہار کے ساتھ ہی ساتھ عصرِ حاضر کے مسائل کی آئینہ داری کرتی ہے۔ نمونہ کلام:

برف کی صورت میری آغوش میں پگھلی وہ آگ
منکشف ہونے میں اُس کے کس قدر ابہام تھا

فرید پربتی اپنی ابتدائی کوششوں سے ہی اپنی حیثیت منوانے میں بہت حد تک کامیاب رہے۔اُن کے کلام میں صوفیانہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔آپ کے کلام میں گہرائی اور گیرائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔غزلوں میں تاثر کی شدت اور وحدت نمایاں ہے۔غزلوں کے علاوہ رباعیاں بھی لکھیں اور فنی اور عروضی لوازمات کے ساتھ ہی ساتھ استعارات اور تلمیحات کا خوبصورت استعمال ان کے کلام کو نئے دور کی نئی شاعری کی پہچان عطا کرتا ہے۔بقول ناظر :

''رباعیات میں وہ (فرید پربتی) اجتماعی محسوسات کو اپنی فنی چابکدستی سے الفاظ کے گلدستوں میں پیش کرتے ہیں۔''[1]

نمونہ کلام:

بجھا ہے دل کا کنول عرصۂ بہار میں ہی
شگفتہ پھول کو بادِ صبا نہ راس آئی

ریاست کی شعری دنیا میں شہباز راجوری کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ان کی غزلوں سے جدید اسلوب کی نمائندگی ہوتی ہے۔ان کے تجربات واحساسات شعری پیکر میں ڈھل کرنت نئی دنیا کی تعمیر کرتے ہیں۔عصری زندگی کی تمام الجھنوں سے واقفیت ان کی شاعری کو زندگی عطا کرتی ہے۔ان کے ہاں زندہ دور کی زندہ شاعری کے امکانات موجود ہیں۔ابتدائی شاعری (غزلوں) میں نیم واضح اور نیم مبہم تجربات کا اظہار ملتا ہے۔

---

[1]......غلام نبی ناظر۔کشمیر میں اُردو شاعری کے پچاس سال۔شیرازہ۔جموں وکشمیر اردو ادب نمبر،کلچرل اکادمی

نمونہ کلام:

اتنے چہروں نے مجھے نوچ لیا ہے اب کے
کس کو ڈھونڈوں میں کسے اپنا شناسا لکھوں

آج سے کئی دہائی پہلے ریاستی شعری اُفق پر ایک نسوانی آواز ابھر کر سامنے آئی۔ رخسانہ جبیں نام کی اس شاعرہ نے اپنے منفرد اسلوب اور لب ولہجہ کے ساتھ نسوانی جذبات کا بھرپور اظہار اپنی غزلوں اور نظموں میں کیا ہے اور کر رہی ہیں۔ وہ اظہارِ ذات کے ذریعے جس نسوانی کردار کو پیش کرتی ہیں اُس کی آواز میں شوخی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ جہاندیدہ تجربہ کاری کی صدائیں بھی پوشیدہ ہیں۔ ذاتی محسوسات اور حسن وعشق کی نیرنگیوں کے علاوہ وہ زندگی کی سچائیوں، فرد کی محرومیوں، کربنا کیوں، زمانے کی بکھرتی قدروں کا برملا اظہار کرتی ہیں۔ بے ساختہ لب ولہجہ ان کی شاعری کو معنویت کی وسعتوں سے ہم کنار کرتا ہے۔ نمونہ کلام:

عجیب سانحہ گذرا ہے اس برس اے دوست
کہ میرا سایہ کسی اور گھر میں رہتا ہے

ایک ان دیکھے کل کی تلاش میں اندھا دھند دوڑ جو آج کل کے دور کے فرد کا مقدر بن چکی ہے اکثر شعراء کے ہاں نئے انداز کے ساتھ موضوع بنی ہوئی ہے۔ ریاست کے منجھے ہوئے شاعر نذیر آزاد کی شاعری بھی اس موضوع کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ان کے ہاں عصرِ حاضر کے تمام تر مسائل و مطالب پورے فنی اور تکنیکی صلاحیتوں کے ساتھ برتے گئے ہیں۔ ان کی غزلوں میں روایت سے شناسائی کی جھلک ملتی ہے اور جگہ جگہ عصرِ حاضر کے انتشار اور مظلومیت و بربریت کی بھی عکاس ہے۔ نذیر آزاد کے بارے میں حامدی صاحب لکھتے ہیں:

"نذیر آزاد روایت کا صحت مند شعور رکھتے ہیں اور ساتھ ہی وہ الفاظ سے پیکر تراشی کا کام لیتے ہیں۔ یہ سنگ سے آئینہ سازی کا عمل ہے۔ نذیر آزاد

آئینہ سازی کے اس عمل میں تندہی سے مصروف ہیں۔"[1] نمونۂ کلام

ہمارے واسطے ہے سنگ ساری کہ ہم نے پتھروں میں خواب بوئے

شفق سوپوری:۔ ریاستی شعری اُفق پر یہ خوش لحن شاعر اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ غزلوں، نظموں کے علاوہ نثری تخلیقات (افسانے، تبصرے) بھی اکثر و بیشتر رسائل کی زینت بنتے ہیں۔ وہ الفاظ کے مزاج شناس ہیں اور اُن کو منفرد انداز میں دائرۂ تحریر و اظہار میں برتنے کے بھی ماہر ہیں۔ اُن کے اکثر اشعار ان کے تخلیقی پختگی کے ضامن ہیں اور اُن میں تازگی اور نغمگی کا احساس ملتا ہے۔ یہ اُن کی وسعتِ نگاہ کا نتیجہ ہے کہ وہ عصری انتشار کو صفحۂ قرطاس پر لانے سے قبل خونِ دل میں اپنا قلم ڈبو دیتے ہیں۔ شفق کی شعری فضا پر حامدی صاحب بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کی شعری فضا میں حد بندی، یک رنگی اور گھٹن کا احساس نہیں ہوتا ہے بلکہ آزادی توسیع اور رنگارنگی کا احساس ہوتا ہے۔"[1]

شفق سوپوری ایک منفرد تحریر و اظہار کے مالک ہیں۔ ملاحظہ کیجئے

برگِ گلاب اب کے برنگِ لہو نہ تھا
تمثالِ خونِ دل کسی کے روبرو نہ تھا

فاروق مضطر کی غزلیں ریاست کی نمائندہ شاعری میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ اپنے تجربات واحساسات کا اظہار مناسب وموزوں پیرائے میں کر کے عصری آگہی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کی شاعری جدید دور کی پیدا کردہ الجھنوں اور خوف وتردد کی داستان ہے۔ نمونۂ کلام:

گھر میں بھی بھر چلا ہے سمندر کا سکوت
بے چارگی کی چھت پہ کھڑا چیختا ہوں میں

[1] ..... غلام نبی ناظر۔ کشمیر میں اُردو شاعری کے پچاس سال۔ شیرازہ۔ جموں وکشمیر میں اردو ادب نمبر۔ کلچرل اکادمی۔ ص۔ ۱۶۲

غلام محمد آجر غزلوں سے زیادہ نظموں میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اساطیر کا استعمال اپنی نظموں میں بڑی موزونیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کی فکری بلندی کا بھرپور احساس نظموں سے ہی ہوتا ہے لیکن کئی غزلوں سے ان کی فنی قدرت اور عصری شعور کا پتہ چلتا ہے۔

نمونۂ کلام:

پھر اُتر جاؤں گا اپنی خامشی کے غار میں
اور اندر گونج کر باہر بھگائے گا مجھے

مسعود ساموں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے عصری آگہی کا بھرپور اظہار کرتے ہیں اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ماہرانہ انداز سے پردہ کشی کرتے ہیں۔

نمونہ کلام:

کوئی معکوس سا کردار ہے مجھ میں پنہاں
فیصلے دونوں طرف اپنے ہی اندر کرتا

فاروق آفاق کے تہہ در تہہ معنی کے حامل اشعار ان کی شعری انفرادیت کے علمبردار ہیں۔ سیاسی انتشار کے ساتھ ساتھ عصری زندگی کے تمام تر مسائل کا اظہار اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔ اُن کو زبان و بیان پر پوری دسترس حاصل ہے۔ طنز ان کی شاعری کا اہم پہلو ہے۔ نمونۂ کلام:

ہو چکا میں روزنِ شب کا اسیر
دو قدم پر دن کا روشندان تھا

چوتھے دور کے دوسرے گروپ کے شعراء میں مندرجہ ذیل ناموں کی فہرست بنائی جاسکتی ہے۔

خالد بشیر، غلام نبی ناظر، ایاز رسول نازکی، احمد شناس، منشور بانہالی، جاوید آذر، تنہا نظامی، ساغر صحرائی، نسرین نقاش، نکہت فاروق نظر، مشتاق مہدی، پریمی

رومانی ، بے تاب جے پوری ،لیاقت جعفری،خالد کرار،علمدار عدم، پرویز مانوس،ستیش ومل، اشرف عادل، پروین راجہ ۔ یہ شعراء ریاستی شعری دامن کونت نئے گل بوٹوں سے سجانے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں اور اس ہنر کا استعمال بھی بخوبی کررہے ہیں۔ریاستی شعری اُفق کی تابنا کی میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

حیات

ریاست جموں و کشمیر کئی حوالوں سے اہمیت کی حامل ہے۔ اپنے خوبصورت اور دلکش مناظر کے لئے جہاں یہ سرزمین عالم بھر میں جانی جاتی ہے وہیں اس دھرتی نے ایسے ایسے رشی منیوں، سنتوں، فقیروں کو جنم دیا ہے جن کا رہتی دنیا تک نام رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ سرزمین ادبی لحاظ سے بھی بڑی مردم خیز ہے۔ یہاں متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کم وبیش ہر زبان میں ادب پیدا ہو رہا ہے۔ اردو، کشمیری، ڈوگری، لداخی، گوجری وغیرہ میں مروجہ عام اصناف پھل پھول رہے ہیں۔

ریاستی سطح پر اگرچہ اُردو کی روایت بہت پرانی نہیں رہی ہے تاہم اس زبان کے متعدد ایسے اعلا پایہ ادیب وشاعر ہوئے ہیں جو عالمی شہرت کے حامل ہیں اور کسی زبان کیلئے بھی باعثِ فخر ہو سکتے ہیں۔ دورِ جدید کے جن شاعروں نے نہ صرف اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے بلکہ ریاست اور بیرونِ ریاست اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے اُن میں حکیم منظور کا نام سرفہرست ہے۔ حکیم منظور کا خاندان اصلاً مخدوم محلّہ زینہ کدل، سرینگر کے ایک علاقے میں رہتا تھا لیکن حکیم منظور کے والد حکیم علی محمد نے جب شادی کی تو انہوں نے گوجوارہ میں جہاں اُن کی سسرال تھی ایک مکان خرید کر بود و باش اختیار کر لی۔ سکونت تبدیل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ حکیم علی محمد کی ساس (حکیم منظور کی نانی) بیٹی کی شادی کے بعد گھر میں تنہا رہ گئیں تھیں۔ کیونکہ ان کا اکلوتا بیٹا (حکیم منظور کے ماموں) ملازمت کے سلسلے میں گھر سے دور راولپنڈی میں رہتا تھا لہٰذا ساس کی ذمہ داری اٹھانے کی غرض سے حکیم علی محمد کو مخدوم محلّہ زینہ کدل سے گوجوارہ (آخون صاحب) منتقل ہونا پڑا اور تادم حیات یہیں رہائش پذیر رہے۔ حکیم علی محمد کا خاندانی پیشہ طبابت تھا وہ بھی اسی پیشے سے

منسلک رہے۔ چھوٹی اینٹوں کی بنی ہوئی اپنی پرانی حویلی کے ایک نچلے کمرے میں مطب چلاتے تھے جہاں وہ لوگوں کو طبی مشورے دیا کرتے تھے۔ اپنے اس پیشے کی وجہ سے انکو قدر و منزلت حاصل تھی۔ دینی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ وہ دیگر مروجہ علوم کی بھی جانکاری رکھتے تھے۔ اچھی خاصی زرعی زمین کے مالک ہونے کی وجہ سے مالی اعتبار سے خاصے آسودہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک خوشحال زندگی پائی۔ وہ ہمیشہ اپنی اولاد کو اقدارِ صالحہ کی پیروی اور پاسداری کا سبق دیتے رہے تا کہ اُن کی شخصیت میں کوئی جھول نہ رہے۔

طبابت کے ساتھ ساتھ حکیم علی محمد سیاست سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ نیشنل کانفرنس کے ایک سرگرم سیاسی رکن بھی تھے۔ سیاسی سرگرمیوں کے سبب کئی بار اُن کے نام گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے۔ مطب کو کچھ مدت کیلئے بند بھی رکھنا پڑا۔ جسکی وجہ سے مالی حالت بھی متاثر ہوئی۔ بالآخر اپنی اہلیہ صدیقہ بیگم کے اسرار پر سیاسی سرگرمیوں سے دور رہنا شروع کیا اور اپنے مطب پر دوبارہ حسبِ سابقہ بیٹھنا شروع کر دیا۔ وہ ایک نہایت خلیق قسم کے انسان تھے۔ خوش مزاجی اور خودداری انکے مزاج کا حصہ تھی۔ انہوں نے خاصی طویل عمر پائی۔ بالآخر ۱۹۸۹ء میں وہ وفات پا گئے۔

حکیم منظور کی والدہ کا نام صدیقہ بیگم تھا۔ وہ گوجوارہ کی رہنے والی تھیں۔ ان کے والد کا نام پیرزادہ غلام رسول تھا۔ صدیقہ بیگم ایک دیندار، سخی اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ ساتھ گھریلو ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھانے کا سلیقہ رکھتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے بچوں کی جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ ذہنی تربیت میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ صدیقہ بیگم خود چونکہ دیندار اور باہنر خاتون تھیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے بچوں کی دینی تربیت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خودداری اور سخاوت کے ساتھ ساتھ اپنے ہمسایوں وغیرہ سے نہ

صرف خود نیک سلوک روا رکھا بلکہ اپنی اولاد کو بھی یہی درس دیا۔ انکی غریب پروری کی ایک مثال پیش کرتے ہوئے حکیم منظور کہتے ہیں:

''میری والدہ کبھی بھی گھر کے دیگر افراد کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتی تھی۔ والد صاحب کو اس بات کی سخت شکایت تھی۔ اُن کے انتقال کے بعد بھی میری والدہ نے اپنی اس روایت کو برقرار رکھا۔ لیکن کوشش کے باوجود اس راز سے پردہ نہ اٹھ سکا۔ ایک دن میں ان کی ٹوہ میں رہا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے حصے کا سالن (گوشت) اپنی غریب ہمساین کو خود لیجا کر دے آتی تھی۔ اسکے علاوہ وہ کبھی کسی کو اسکے مانگنے پر کوئی چیز دینے سے انکار کرتے نہیں دیکھی گئیں۔''[1]

صدیقہ بیگم ایک باصلاحیت خاتون تھیں۔ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے جب ان کے شوہر پر پیغمبرانہ وقت آن پڑا تو انہوں نے اون کات کر ایک انگوچھا اور ایک پھرن کا کپڑا تیار کیا۔ بچپن میں والدہ سے جس تربیت کی تحریک ملی وہ حکیم منظور کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے۔

ولادت:

محمد دین فوق کی مرتب کردہ 'تاریخ اقوامِ کشمیر' میں جس حکیم خاندان کا ذکر ہوا ہے حکیم منظور کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ وہ ۱۷ر جنوری ۱۹۳۷ء میں حکیم علی محمد کے گھر واقع آخون صاحب گوجوارہ میں پیدا ہوئے لیکن حکیم منظور اس سنِ پیدائش کو درست نہیں مانتے۔ ان کے مطابق سال پیدائش ۱۹۳۸ء ہے جسکا کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں۔ صرف منظور صاحب کا کہنا ہے کہ اُن کے بڑے بھائی حکیم طاہر اُن سے تین سال بڑے ہیں اور انکا سن پیدائش جولائی ۱۹۳۵ء ہے۔ بہرحال اسکول اور میونسپلٹی ریکارڈ کے مطابق حکیم منظور کی تاریخ پیدائش ۱۷ر جنوری

[1]...... ایک انٹرویو.......... حکیم منظور کے ساتھ

۱۹۳۷ء ہی ہے۔ چھ سال کی عمر میں انکو اسکول میں داخلہ دلایا گیا۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے جبری اسکول میں حاصل کی اور اسلامیہ ہائی اسکول سرینگر سے ۱۹۵۴ء میں انہوں نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ایس پی کالج سرینگر میں ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ اپنی تعلیمی تشفی کیلئے انہوں نے علی گڑھ سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا اور علی گڈھ ہی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۷ء میں حکیم منظور نے سرکاری ملازمت شروع کی۔ ریاستی سرکار کے مختلف محکموں میں اعلا عہدوں پر فائز رہے۔ سرکاری ملازمت میں بہتر کارکردگی کے نتیجے میں انہیں کے اے ایس کیڈر میں شامل کیا گیا۔ ۱۹۹۵ء میں ڈپٹی کمشنر بارہمولہ کے عہدے سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

ملازمت کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۹۵۷ء میں حکیم صاحب نے سرکاری ملازمت بحیثیت لور ڈویژن کلرک (LDC) شروع کی۔ اپنی محنت اور لگن سے پندرہ سال کے بعد ۱۹۷۲ء میں حکیم منظور گزیٹیڈ کیڈر میں شامل ہوئے اور ڈپٹی کسٹوڈین کے عہدے پر اُن کا تقرر ہوا۔ یہ ترقی حکیم منظور کی بہتر کارکردگی کے عوض ریاستی کابینہ نے منظور کی۔ ۱۹۷۵ء میں انہیں کسٹوڈین کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ اپنی اس ترقی کی یاد تازہ کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں:

> "۱۹۷۵ء میں مرزا محمد افضل بیگ کی سربراہی میں ایک کمیٹی نے جس میں گنشیام شرما (اس وقت کے فارسٹ سیکرٹری) اور شری بھارت بھوشن (اُس وقت کے ایڈیشنل چیف سیکرٹری) ممبران کی حیثیت سے شامل تھے۔ میرا انٹرویو لیا اور فوراً نتیجے کا اعلان کیا اور مجھے کسٹوڈین کے عہدے پر ترقی دی گئی۔"[۱]

۱...... ایک ملاقات۔ حکیم منظور کے ساتھ

۱۹۷۵ء ہی میں حکیم منظور کو کچھ وقت کیلئے اوقاف اسلامیہ جموں کا چارج بھی دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد حکیم منظور کو اسسٹنٹ کمشنر بنا کر کٹھوعہ بھیجا گیا لیکن اپنی اس تقرری کو وہ سیاسی رسہ کشی سے تعبیر کرتے ہیں۔ کٹھوعہ سے تبادلہ کے بعد آپ کو سیکرٹری ڈیولپمنٹ اتھارٹی بنایا گیا۔ ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۶ء دو سال تک وہ ریذیڈنٹ کمشنر (دہلی) رہے۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء تک ایڈیشنل سیکرٹری ایگریکلچر اور پھر ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۲ء تک کے پرآشوب دور میں وہ محکمہ تعلیم کے ناظم اعلا (Director) رہے۔ پھر ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۵ء تک ڈی سی بارہمولہ کے عہدے پر فائز رہے اور اسی جلیل القدر عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ انہوں نے اپنی لیاقت اور بہترین کارکردگی سے ایڈمنسٹریشن پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی۔ تمام عہدوں پر بحسن و خوبی اپنے فرائض انجام دیئے۔ جس کا اعتراف ان کے آفیسران اور ماتحت آج تک کرتے ہیں۔

حکیم منظور چونکہ خوددار قسم کے انسان ہیں اس لئے دوران ملازمت بھی انہوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی۔ وہ حکومت کے بنیادی ڈھانچے میں پنپ رہی غلط روایتوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بہت حد تک اس کی کوشش بھی کی جس کیلئے انہیں کبھی کبھی اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ راقم کے ایک استفسار کے جواب میں ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا:

> ''میں دہلی میں ریذیڈنٹ کمشنر تھا۔ اسی دوران ریاست کے اس وقت کے چیف سیکرٹری شری آر۔ کے۔ ٹکّر وہاں سرکاری دورے پر آئے منیجر نے مجھ سے دریافت کیا کہ ٹکّر صاحب سے کرایہ وصول کرنا ہے کہ نہیں۔ بجائے اس کے کہ میں کہتا کہ چالیس روپے کا کرایہ میں ادا کروں گا اور ٹکر صاحب کی خوشنودی حاصل کرتا میں نے منیجر سے کہا کہ پورا کرایہ اور کھانے کا بل چیف سیکرٹری

صاحب سے وصول کریں تاکہ ایک بری روایت کا چلن ختم ہوسکے۔اس طرح میں نے کمشنری گنوادی۔ جونہی گورنرراج نافذ ہوا پہلی ٹرانسفر میری ہوئی اور میں نے جب گورنر جناب جگموہن صاحب سے اپنی تبدیلی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے ٹکر صاحب سے ٹکر لی ہے۔''[1]

حکیم منظور اپنے خاندانی نام 'حکیم' کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

'حکیم ہماری ذات نہیں ہے۔ طبابت چونکہ ہمارا خاندانی پیشہ تھا یہی وجہ ہے کہ نام کے ساتھ حکیم جڑ گیا۔''[2]

حکیم منظور کی شادی صرف سترہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہی غلام جیلانی بانو خاتون سے ہوئی۔ان کے چہرے پر سادگی کے پرتو جھلکتے ہیں۔۶۷ سالہ شادی شدہ زندگی میں آج بھی وہ پورے انہماک اور محبت کے ساتھ حکیم منظور کا ساتھ نبھارہی ہے۔ حکیم منظور صاحب کا ایک بیٹا ہے جسکا نام حکیم محمد آفاق ہے اور وہ دہلی کے ایک فرم میں بطور نیٹ ورک انجینئر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ان کی شادی محترمہ شبنم نامی خاتون سے ہوئی ہے جن سے وارث اور والی نامی دو بچے ہیں۔اس لحاظ سے حکیم منظور کی زندگی کامیاب قرار دی جاسکتی ہے۔ جہاں وہ سارے رشتوں کی لطافتوں کی لذت محسوس کررہے ہیں۔

حکیم منظور کی حیات کا باب راقم نے تمام تفصیلات کی جانکاری اوران کی شاعری کی بنیاد پر مکمل کرلیا تھا۔لیکن اب اس باب کی حیثیت ادھوری سی محسوس کی جارہی ہے۔ کیونکہ حکیم منظور ۲۱ر دسمبر ۲۰۰۶ءکو رحلت کر گئے اوراپنے مالکِ حقیقی سے جاملے۔

---

[1] ......ایک ملاقات۔حکیم منظور کے ساتھ   [2] ......ایک انٹرویو حکیم منظور کے ساتھ

صورتِ لمس نہ پھر کبھی ہاتھ آئیں گے
لمحے تحریر نہیں ہوں تو بکھر جائیں گے

حکیم منظور کے اس شعر کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس شعر کا خالق واقعی صورتِ لمس کبھی بھی دوبارہ ہاتھ نہ آنے کیلئے اس فانی دنیا کو چھوڑ کر چلا گیا۔ لیکن ایسی شخصیات بکھر کر فنا ہونے کیلئے پیدا نہیں ہوا کرتیں بلکہ اپنی تحریروں میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے زندہ وجاوید رہتی ہیں۔ بہرحال راقم کو اس بات کا اندازہ بھی نہ تھا کہ اس باب میں حیات کے تعلق سے اس طرح کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ یوں تو حکیم منظور کافی وقت سے بیمار تھے۔ وہ ذیابیطس کے عارضے میں مبتلا تھے۔ اسی وجہ سے ان کے گردوں کے علاوہ انکی بینائی بھی متاثر ہوگئی تھی جسکے نتیجے میں کئی بار آنکھوں کا آپریشن کرانا پڑا تھا۔ علاج کے سلسلے میں زیادہ تر وقت دہلی میں ہی گزرتا تھا۔ پچھلے تین سال سے بسترِ علالت پر تھے۔ ان کے فرزند انکی برابر نگہداشت کرتے رہے۔ جمعرات کی صبح یعنی ۲۱ / دسمبر ۲۰۰۶ء صبح کے ساڑھے گیارہ بجے وہ نئی دہلی کے ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ حکیم منظور کا جسدِ خاکی موسم کی خرابی کی وجہ بذریعۂ طیارہ دوسرے دن سرینگر پہنچایا گیا۔ جہاں انہیں اپنے آبائی مقبرے واقع بہاؤ الدین صاحب میں دفن کیا گیا۔ انکی تجہیز و تکفین کے دوران وادیٔ کشمیر میں برف باری ہورہی تھی۔ انکو برف سے بہت انسیت تھی۔ خود کو برف زاروں کی مملکت کا نمائندہ کہنے والا یہ شاعر برفباری میں ہی اپنے آخری سفر پر روانہ ہوا۔ لوگوں کے مطابق ان کی قبر کے اندر برف کی سفید چادر بچھ گئی۔ حکیم منظور کو کشمیر اور کشمیر کی ہر شے سے محبت وعقیدت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے آخری دنوں میں کشمیر واپس لوٹ آنے کی بہت ضد کی تھی۔

حکیم منظور اس معتبر شخصیت کا نام ہے جس کے شعری ونثری کارنامے تقریباً ایک آدھی صدی پر مشتمل ہیں۔ برصغیر خصوصاً وادی کشمیر میں حکیم منظور کی شاعری کا

حلقۂ قارئین بہت وسیع ہے۔ لہٰذا ان کی وفات پر رنجیدگی کا اظہار کرنا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ان کی وفات کی خبر سنتے ہی ساری ریاست میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی اور کئی ادبی، تمدنی، ثقافتی انجمنوں کے ساتھ ساتھ کچھ سیاسی پارٹیوں نے بھی تعزیتی اجلاس منعقد کیے۔ مقامی اخباروں میں کئی ادبی ہستیوں کے تاثرات کے ساتھ حکیم منظور کا اجمالی تذکرہ بھی شائع کیا گیا۔ ان کی وفات پر راقم نے چند تحریری اور تقریری معلومات کی بنیاد پر کئی اہم شخصیات کے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔

ریاستی سرکار کے اعلا عہدے داراں، وزراء، سیاست داں اور غیر ادبی شخصیات نے اس عظیم شاعر کی وفات کو ایک سانحہ قرار دے کر ان کے تئیں خراج عقیدت کا اظہار کیا۔ ان کی ادبی کاوشوں کو یاد کرتے ہوئے ریاست جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ غلام نبی آزاد اور ان کی اہلیہ شمیم آزاد نے انہیں ریاست کا جدید اردو شاعر قرار دیا۔ ان کا کہنا ہے:

> 'انہوں نے (حکیم منظور) شاعری کو محض ادبیات تک ہی مخصوص نہ رکھا بلکہ ریاست کے تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ عصری حالات کا عکاس بھی بنایا۔'[1]

ڈپٹی ڈائریکٹر انفارمیشن جناب فدا علی نے حکیم منظور کو بڑا شاعر اور عظیم انسان قرار دیا۔ جس نے لوگوں کے دکھ درد محسوس کئے اور خوشیاں بانٹیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "Manzoor's invaluable contribution to Urdu literature will survive with the survival of literature"

ریاست کے نامور کشمیری شاعر اور دانشور ظریف احمد ظریف اپنے دوست کی جدائی پر بہت سوگوار تھے۔ ان کا کہنا ہے:

---

[1]...... روزنامہ گریٹر کشمیر، سرینگر کشمیر

'آج میں نے اپنے ۳۵ سال پرانے دوست اور استاد کو کھو دیا۔'

مخمور بدخشی حکیم منظور کی وفات پر اپنا اظہارِ خیال یوں کرتے ہیں:

'منظور میرا منظور تھا، مگر اللہ کو کیا منظور ہوتا ہے یہ کسی کو معلوم نہیں۔

بس اتنا کہوں کہ:

'گوہرِ بے بہا ز دنیا رفت'

ریاست کے جانے مانے شاعر ہمدم کاشمیری کا کہنا ہے۔

'ہم نے آج نہ صرف ایک عظیم شاعر بلکہ ایک عظیم انسان کو کھو دیا۔'

ریاست کے ایک اور شاعر اور براڈ کاسٹر جناب رفیق راز حکیم منظور کے انتقال کو برِ صغیر کے ادب نواز حلقوں کیلئے ایک سانحہ قرار دیتے ہیں۔

کشمیری شعر و ادب کا ممتاز اور معتبر شاعر جناب رحمٰن راہی کا کہنا ہے۔

'اردو اور کشمیری ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پر کرنا محال ہے۔

جب بھی اردو کی تخلیقی سرگرمیوں کا تذکرہ ہوگا سبھی سخن فہم اصحاب کی زبان پر حکیم منظور کا نام ضرور آئے گا۔'[1]

اس سلسلے میں ریاست کی تمام ادبی انجمنوں نے تعزیتی جلسے منعقد کیے جن میں ریاستی کلچرل اکادمی کا نام اہم ہے۔ سرمائی راجدھانی جموں کے علاوہ گرمائی راجدھانی سرینگر میں بھی اس قسم کے اجلاس ہوئے۔ جہاں مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے ریاست کے نامور ادیبوں سے حکیم منظور اور ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں پرچے لکھوانے کی تجویز بھی سامنے آئی تا کہ اکادمی کے رسالے 'شیرازہ' (اردو) کا 'حکیم منظور نمبر' ترتیب دیا جاسکے۔ اسکے علاوہ چھوٹی بڑی کئی ادبی انجمنوں نے تعزیتی اجلاس منعقد کر کے جہاں اپنی ادب نوازی کے ثبوت فراہم کیے وہیں مرحوم کی حیات اور کارناموں کا تفصیلی تذکرہ بھی کیا۔

[1] ...... کشمیر عظمیٰ۔ روزنامہ سرینگر۔ کشمیر

یہ حقیقت ہے کہ ایسی عہد شناس اور عہد آفرین شخصیات کئی صدیوں کے بعد ہی جنم لیتی ہیں۔ حکیم منظور منجھے ہوئے فنکار، ادب نواز، بہترین منتظم ہونے کے علاوہ انسان دوست بھی تھے۔ انہوں نے کئی اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہ کر اپنی اہلیت اور عوام دوستی کا ثبوت دیا۔ شعروادب اور صحافت کے تئیں حکیم منظور کی خدمات کو ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔

حکیم منظور کی وفات جہاں شعروادب کیلئے ایک ناقابل تلافی زیاں ہے وہیں راقم کیلئے بھی ایک ذاتی صدمہ ہے۔ حکیم منظور کی حیات سے متعلق یہ باب اولین ابواب میں شمار ہے اور باب دوم کا پہلا ذیلی حصہ ہے۔ جب کہ ان کی غزل گوئی، نظم نگاری، صحافت، غیر مطبوعہ کلام اور حکیم منظور کا مقام ومرتبہ یہ تمام ابواب بعد کے ہیں اور ان کی وفات سے قبل تحریر کئے گئے ہیں۔ لہٰذا ان کی نوعیت زمانۂ حال کی ہے۔

عہد اور ماحول

حکیم منظور نے طبیعت موزوں پائی تھی۔ ذوقِ سخن کی تحریک انکو اپنی والدہ صدیقہ بیگم سے ملی۔ وہ ایک پڑھی لکھی، دیندار اور تخلیقی ذہن رکھنے والی خاتون تھیں۔ وہ حکیم منظور کے بچپن ہی سے مختلف جنگ ناموں کے ابیات، مثنویوں، منظوم قصے، کہانیوں، کشمیری ونہ ون[1] اور خود تخلیق کردہ رؤف[2] اُن کے کانوں تک پہنچا کر ایک معلمۂ شاعری کا کردار ادا کرتی رہیں۔ بچپن میں جب کوئی سریلی آواز بچے کے ذہن پر اپنی چھاپ چھوڑتی ہے تو اس کا اثر آئندہ زندگی میں بھی ظاہر ہونا ایک فطری بات ہے۔ خاص کر جب یہ کام ایک ماں انجام دیتی رہی ہو۔

اسلامیہ ہائی اسکول کے طالب علمی کے دوران ہی حکیم منظور کے ادبی شوق کو ابھرنے کا موقعہ ملا اور آگے کی راہیں واضح اور وسیع تر نظر آنے لگیں۔ ادبی ذوق وشوق اور موزوں طبیعت ہی کی وجہ سے، وہ اسلامیہ ہائی اسکول کے ادبی میگزین ''الہلال'' کے ایڈیٹر بنادیئے گئے۔ اس وقت وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ اُس زمانے کے اردو پڑھانے والے استاد عبدالاحد رفیقی صاحب نے حکیم منظور کی ذہانت اور قابلیت کو بھانپ لیا تھا کیونکہ انہوں نے حکیم منظور سے ایک نایاب کتاب 'ہندوستانی لسانیات' کی نقل کروائی تھی۔ انھی استاد کی سفارش سے حکیم منظور اسکول میگزین کے ایڈیٹر بنادیئے گئے تھے۔ اس کتاب کی نقل کے دوران اُردو زبان کی بنیادی باتوں سے انہیں واقفیت حاصل ہوئی۔ میرے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں۔:

۱، ۲ ...... کشمیری لوک گیت

''اس نایاب کتاب کی نقل کرتے وقت مجھے اردو زبان سے عشق ہوا اور لوگوں کیلئے میری اُردو لکھنے پڑھنے کی استطاعت قابل توجہ بن گئی۔''[1]

دورانِ تعلیم حکیم منظور کئی ادبی انجمنوں سے وابستہ رہے۔ ادبی انجمنوں سے وابستگی اور اس زمانے کے اُردو شعراء و ادباء اور محققین کا ساتھ سونے پر سہاگہ کا کام کرتا رہا۔ ۱۹۵۵ء میں منظور صاحب 'حلقہ علم و ادب خانیار' کی ایک ادبی انجمن کے قابلِ توجہ رکن بن گئے۔ کچھ عرصے کے بعد انہیں 'اربابِ ذوق' کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اس انجمن میں مرحوم برج پریمی، پشکر ناتھ بی اے، مخمور حسین بدخشی اور کئی متعدد حضرات مختلف عہدے دار تھے۔ یہ دونوں ادبی انجمنیں (جماعتیں) وقت کے اربابِ اختیار کی معاونت سے چلتی تھیں۔

حکیم منظور نے اپنا ادبی سفر شاعری سے نہیں بلکہ افسانہ نگاری سے شروع کیا۔ ۱۹۵۶ء میں انکی کہانیاں ''مارتنڈ' اور 'کشمیر' جیسے مقامی روزناموں کے علاوہ 'ویکلی چترا' دہلی سے بھی شائع ہوتی رہیں۔ ابھی تک شعر گوئی کی طرف ان کی طبیعت مائل نہیں ہوئی تھی۔ ملازمت کے دوران ۱۹۵۸ء میں حکیم صاحب نے اپنے ایک افسر مرحوم میر غلام حسن، جو اس زمانے میں فارسٹ محکمے کے سیکرٹری تھے ، کے انگریزی مضمون کا اُردو ترجمہ کیا اور انہی کی ہدایت پر ریڈیو کشمیر سرینگر جاکر کمال احمد صدیقی صاحب سے ملے۔ مضمون کا اردو ترجمہ دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوئے اور حکیم منظور سے شعر گوئی کے بارے میں دریافت کرنے لگے۔ گو حکیم منظور شعر فہم تھے مگر ابھی تک شعر نہیں کہتے تھے۔ پھر بھی حامی بھردی۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں اُس واقعے کو یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

'کمال احمد صدیقی نے جھٹ سے ایک مصرعہ طرح دیا

ا۔۔۔۔۔حکیم منظور۔ ایک ملاقات

"دیوانۂ بہار تعجب کی بات ہے"

اور کہا کہ اس پر غزل لکھ کے لاؤ۔ میں آپ کو اگلے پروگرام کیلئے بک کرتا ہوں۔ میری پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ میں نے بحور واوزان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں اور غزل لکھ دی۔ ایک مصرعہ یعنی گرہ کا مصرعہ یوں تھا۔

"فصلِ خزاں میں ڈھونڈ رہا ہے بہار کو"

غزل کے باقی اشعار کمال صاحب کے قلم کے تظلم کا شکار ہوئے۔ اس کے بعد میں نے شعر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا بلکہ افسانہ لکھنا بھی ترک دیا۔"[1]

۱۹۶۴ء تک حکیم منظور کی ادبی سرگرمیوں پر جمود طاری رہا۔ شاعری کا باقاعدہ آغاز انہوں نے ۱۹۶۴ء میں کیا۔ اُس وقت جدیدیت کا رجحان غالب تھا۔ جدید شاعری کا بیشتر سرمایہ اندھا دھند تقلید کی وجہ سے اپنی انفرادیت قائم نہیں رکھ سکا۔ حکیم منظور اپنی ایک الگ شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے روایت کا احترام کیا لیکن اسے اپنے فن پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

حکیم منظور نے مادری زبان (کشمیری) کے بجائے دانستہ طور پر اُردو کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ ۱۹۶۴ء میں وہ سرکاری دفاتر کی منتقلی کے سلسلے میں جموں چلے آئے۔ جہاں اُردو زبان ہی اظہارِ ذات کا وسیلہ تھی۔ مجید مضمر لکھتے ہیں:

"وہ (حکیم منظور) یہ بات جانتے تھے کہ اس زبان کی قلمرو پیر پنچال ہی کیا برصغیر کی سرحدوں سے بھی پرے ہے اور یہ کہ اس زبان کی وساطت سے وہ اپنی شناخت قائم کر سکتے تھے اور یہ کہ اس میں اخروٹ نکہتوں کی شناخت کروانا

[1]...... حکیم منظور کے ساتھ ایک انٹرویو۔

جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ حکیم منظور یہ جوئے شیر لے آئے۔''[1]

جموں کے قیام کے دوران حکیم منظور اُسی ذوق وشوق سے ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ اُسی زمانے میں ان کے حلقہ احباب میں کئی سربرآوردہ، مستند اور معتبر قلم کار اور شاعر شامل ہوئے جن میں پروفیسر شیام لال کالڑا (عابد پشاوری)، پروفیسر منظر اعظمی، عابد مناوری، نور صدیقی نورؔ، عرشؔ صہبائی اور میکشؔ کاشمیری شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ شعروادب پر گفتگو کے دوران حکیم منظور کو اپنے شوقِ مطالعہ کو مہمیز کرنا پڑا کیونکہ معاملہ عالموں سے بات کرنے کا درپیش تھا۔ جموں میں اپنی ادبی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جموں میں ''بزمِ فروغِ اردو'' کے نام سے ایک ادبی انجمن کام کرر ہی تھی۔ یہ بزم ہر ہفتے اتوار کے دن ایک محفل آراستہ کرتی تھی جس میں مختلف قلم کاروں کے علاوہ عام لوگ بھی شامل ہوتے تھے اور وہاں پڑھی جانے والی تخلیقات پر تنقید وتبصرہ ہوتا تھا۔ میں پابندی کے ساتھ اس بزم کی نشستوں میں شامل رہتا تھا اور اسکی سرگرمیوں میں اتنی دلچسپی لیتا تھا کہ چھ مہینے کے بعد منعقد ہونے والے انتخابات میں مجھے ہی نائب ِصدر کے طور پر منتخب کیا جاتا۔ ۱۹۶۶ء میں میں اس بزم کا صدر منتخب ہوا اور پھر جب تک جموں میں رہا یعنی ۱۹۸۹ء تک میں بزم کا صدر بنا رہا۔ ہر چند کہ تفرقہ پردازی اور راتوں رات بڑے ادیب اور شاعر بننے والے ادیبوں کی ریشہ دوانیوں سے کئی اور ادبی جماعتیں قائم ہونے کی وجہ سے 'بزم فروغِ اردو' کا شیرازہ بکھر سا گیا۔''[2]

---

[1]۔۔۔۔۔ڈاکٹر مجید مضمر۔رنگ باتیں کریں۔ص ۹۵

[2]۔۔۔۔۔راقم کے ساتھ حکیم منظور کا ایک انٹرویو

حکیم منظور کے شعری ذوق کی اولین تربیت اُن کے اپنے ہی گھر میں ہوئی تھی۔ شعری سفر کے دوران جن ادبی ہستیوں نے ان کی شعری شخصیت کو بنانے اور اُردو دنیا میں متعارف کرانے میں بھر پور حصہ ادا کیا۔ اُن میں راج نرائن راز کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں اہلیانِ جموں نے بھی بہت اہم رول ادا کیا۔ حکیم منظور اس بات کے اعتراف میں کہتے ہیں:

"میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ راج نرائن راز نے میرے شعری سفر کو آسان بنادیا اور اُردو دنیا میں متعارف کرانے میں اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لائے۔ اہل جموں علی الخصوص وہاں کے ادباء و شعراء نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھائے رکھا۔ جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اُس زمانے میں ملک بھر میں مشہور ادبی انجمن 'بزم فروغ اُردو' کی صدارت کا انتخاب دس سال سے زیادہ عرصے تک اکثریت سے جیتتا رہا۔"[1]

حکیم منظور کو اپنا کلام مرتب کرنے اور شائع کرنے کی تحریک سب سے پہلے عابد مناوری نے دی اور بعد ازاں راج نرائن راز نے انکی کتابوں کی طباعت اور اشاعت کا ذمہ اپنے سر لیا کیونکہ ۱۹۷۶ء تک اتنا کلام اکٹھا ہو گیا تھا کہ اُسے ایک شعری مجموعے کی شکل دی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ناتمام کے عنوان سے ۱۹۷۷ء میں اُن کا پہلا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا۔ اس کا دیباچہ حکیم منظور کے دوست راج نرائن راز نے لکھا۔ ۱۹۷۹ء میں اس مجموعۂ غزل کو جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز نے انعام کے لئے منتخب کیا۔ اسی مجموعے کو ۱۹۷۹ء ہی میں بنگال اردو اکادمی اور یوپی اُردو اکادمی نے یکے بعد دیگرے ایوارڈ سے نوازا۔ 'ناتمام' کے بعد حکیم منظور کے قلم سے اشعار کا دریا رواں دواں ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں اب تک

[1]......راقم کے ساتھ حکیم منظور کی ایک ملاقات

گیارہ اُردو شعری مجموعے، جن میں دو کشمیری شعری مجموعے بھی شامل ہیں اشاعت پذیر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۸۲ء میں حکیم منظور کا دوسرا مجموعہ غزل 'لہو لمس چنار' کے نام سے انڈیا بک ایمپوریم بھوپال (ایم پی) سے شائع ہوا۔ ۱۹۹۰ء میں ایک اور غزلوں کا مجموعہ 'برف رُتوں میں آگ' عابد مناوری کی ترتیب و انتخاب کے ساتھ منظرِ عام پر آیا اور ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی سے شائع ہوا۔ حکیم منظور کے اس شعری مجموعے کو یو پی اُردو اکیڈمی نے ایوارڈ سے نوازا۔ اگلے ہی سال یعنی ۱۹۹۱ء میں اسّی غزلوں پر مشتمل ایک اور مجموعہ غزل اشاعت پذیر ہوا۔ 'خوشبو کا نام نیا' کے نام سے یہ مجموعہ جے کے آفسیٹ پریس دہلی سے شائع ہوا۔

غزلوں کے ساتھ ہی ساتھ حکیم صاحب نے نظم نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ وہ ایک کامیاب نظم گو شاعر ہیں۔ جنوری ۱۹۹۳ء میں ''پھول شفق آنگن کے'' کے نام سے نظموں کا ایک مجموعہ منظرِ عام پر آیا جس کا پیش لفظ قاضی غلام محمد صاحب نے لکھا ہے۔ ۷۵ صفحات پر مشتمل اس مختصر مجموعے کو حکیم منظور نے دنیا کے تمام اہل دل اور اہل درد کے نام انتساب کر کے اپنے صاحبِ دل ہونے کا پختہ ثبوت فراہم کیا ہے۔ ۱۹۹۷ء میں 'شعر آسماں' کے نام سے غزلوں کا ایک اور مجموعہ اپنی پوری آب و تاب اور تازہ خوشبوؤں کو سمیٹے منظر عام پر آیا۔ ۱۰۳ صفحات پر مشتمل یہ دیدہ زیب شعری مجموعہ ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے صدر غلام رسول ملک نے اس مجموعے کا پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی نے اس کتاب کو سراہتے ہوئے بہترین کتاب (Best Book) کا ایوارڈ دیا اور ساتھ ہی یو پی اُردو اکادمی نے بھی 'شعر آسماں' کو ایوارڈ سے نوازا۔

۱۹۹۸ء میں اِکیاسی غزلوں پر مشتمل ایک اور دیدہ زیب مجموعہ 'صبح شفق تلاوت'، حکیم منظور کی شعری کاوشوں میں شمار ہوا۔ خبر و نظر پبلی کیشنز۔ ۱۰ پرتاپ پارک سے شائع شدہ اس مجموعے کا پیش گفت حکیم منظور کے مشفق دوست راج

نرائن راز نے تحریر فرمایا ہے۔ ریاستی کلچرل اکادمی نے ۲۰۰۳ء کے مختلف زبانوں میں سالانہ انعامات کی فہرست جاری کی اور 'صبح شفق تلاوت' کو اُردو کے زمرے میں نمایاں رکھ کر انعام سے نوازا۔

حکیم منظور جیسا حساس اور گہری سوچ کا حامل شاعر بھلا کب تک اپنی مادری زبان 'کشمیری' کا حق ادا نہ کرتا۔ چنانچہ انہوں نے کشمیری غزلوں کا ایک مجموعہ ترتیب دیا جسکا نام "مے چھُ ورتن تے" ہے۔ اس مجموعے کا سال اشاعت دسمبر ۱۹۹۸ء ہے اورسکا پیش لفظ کشمیری اور اردو کے مشہور شاعر رفیق راز نے لکھا ہے۔ 'دپیوم بالہ یارس' حکیم منظور کا دوسرا کشمیری شعری مجموعہ ہے۔ یہاں بھی شاعر پورے انہماک کے ساتھ اپنے شعری تجربات صفحۂ قرطاس پر اتارنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ ان مجموعات کی اشاعت اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شاعر اپنی مادری زبان (کشمیری) کی چاشنی سے نہ صرف واقف ہے بلکہ ان کے دل میں اس زبان کیلئے محبت اور عقیدت کے جذبات موجود ہیں۔

کشمیری کلام کے بعد ایک بار پھر حکیم منظور کے زورِ قلم کا نتیجہ نظموں کے مجموعے کی صورت میں سامنے آیا۔ 'برفِ آفتاب' کے نام سے یہ نظموں کا مجموعہ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کا پیش لفظ حکیم منظور کے ہم عصر شاعر اور نقاد ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے لکھا ہے۔ اس کتاب کے آخیر میں بیس صفحات پر مشتمل 'شہرِ آشوب' لکھ کر شاعر نے عصری آگہی کے گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔

آٹھ اردو شعری مجموعوں کے بعد 'سخن برف زاد' نام سے ایک اور مجموعۂ شعر زعفرانی حاشیہ میں مزین خوبصورت کمپوزنگ اور دیدہ زیب سرورق لئے اُردو ادبی دنیا میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ یہ کتاب ریاستی کلچرل اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔ اس مجموعۂ شعر کا انتساب اُردو کے اُن نام نہاد شیدائیوں کے نام ہے جو اُردو زبان کا رسم الخط بدل کر اِسے زندہ دفنانے کے درپے ہیں۔ حکیم

منظور نے اس مجموعے کی ابتداء میں 'بہ قلم خود' کے عنوان سے اُردو کے خلاف سازشوں سے متعلق بحث کرتے ہوئے ناراضگی کا برملا اظہار کیا ہے۔

حکیم منظور کا ایک اور اُردو شعری مجموعہ "قلم، زبان، شگاف" کے نام سے نومبر ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ ۱۰۶ غزلوں پر مشتمل یہ کتاب شاعر کے تمام تر تجربات پر محیط ہے۔ حکیم منظور نے یہ کتاب ڈاکٹر بشیر احمد نحوی کے نام انتساب کی ہے۔ اس مجموعے کے آخر میں تضمین بر غزل اقبالؒ علامہ اقبال کے تئیں شاعر کے عقیدت کے اظہار کا مظہر ہے۔

شاعری کے میدان میں اپنا لوہا منوانے کے ساتھ ہی ساتھ حکیم منظور نے ایک قابل نثار ہونے کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ اُن کے کئی افسانے، (جواب دستیاب نہیں ہیں) تبصروں اور تنقیدی مضامین کے علاوہ 'اقبال ایک تذکرہ' نامی کتاب ایک اہم نثری کارنامہ ہے۔ یہ کتاب مارچ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی ہے۔ حکیم منظور نے یہ کتاب خاص طور پر اقبال انسٹی چیوٹ آف کشمیر یونیورسٹی سرینگر کیلئے لکھی ہے۔ جو کئی ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اقبال فہمی میں بڑی معاون ومددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

حکیم منظور کا ماحول ہر اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سیاسی، معاشرتی، ادبی اور تہذیبی میلانات کا بھرپور شعور رکھتے ہیں۔ زندگی کی پر پیچ راہوں میں کتنے ہی نشیب وفراز آئے لیکن انہوں نے ایک لمساس انسان اور سچے شاعر کی طرح اُن کا اثر قبول کیا اور آگے بڑھتے گئے۔

شخصیت

انسان کی پہچان اس کی شخصیت سے ہوتی ہے اور کسی فرد کی شخصیت کی تشکیل میں کئی عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ جہاں اُن عناصر کی ترتیب و تشکیل کیلئے قدرت کی دست کاری کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے وہیں اس عمل میں ماحول کا بھی خاصا حصہ ہوتا ہے، جس میں اُس شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ مناسب ماحول فراہم ہونے پر کوئی شخصیت legend بن جاتی ہے۔ حکیم منظور کی شخصیت کو بنانے میں جہاں ایک طرف ہمیں مشیت ایزدی کی کارفرمائی نظر آتی ہے تو دوسری طرف اُس ماحول کی کرشمہ سازی بھی جاری و ساری نظر آتی ہے۔ جس نے انکی شخصیت کی تربیت میں اہم رول ادا کیا ہے۔ مثلاً ان کے شاعر ہونے کو اگر منشِ الٰہی سے معمول کیا جائے تو اس منزل تک رسائی حاصل کرنے کیلئے جن منازل نے ان کیلئے تحریک کا کام کیا۔ اسے ماحول کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

حکیم منظور خوبصورت بھی ہیں اور خوب سیرت بھی۔ وہ خوش لباس بھی ہیں اور خوش وضع بھی۔ ان کی خوش گفتاری نے تو ان کے حلقۂ احباب کو وسعت عطا کی ہے۔ ہر کسی سے تپاک سے ملنے والا یہ شخص زندگی کے کئی ذائقے چکھ چکا ہے۔ انہوں نے زندگی کے کئی رنگ دیکھے ہیں اور زندگی کے مختلف تجربات نے حکیم صاحب کی شخصیت کو عصرِ حاضر کی بڑی اور اہم شخصیات میں شمار کیا ہے۔ ڈاکٹر مجید مضمر لکھتے ہیں:

> ''بڑائی عہدے میں نہیں ہوتی شخصیت میں ہوتی ہے۔ اگر حکیم منظور کی شخصیت بڑی یا اہم ہے تو اس وجہ سے کہ اس

شخصیت کا اپنا ایک رنگ ہے۔ پکا اور انمٹ۔"!

حکیم منظور معاملہ فہم ہیں۔ ان کے اندر انکساری کے ساتھ ساتھ خودداری نمایاں نظر آتی ہے۔ لہجہ کبھی کبھی تحکمانہ اور کرخت ہوتا ہے لیکن ہونٹوں پر پھیلے تبسم یا آنکھ کے اشارے سے یہ کرختگی ہوا ہو جاتی ہے۔ نوجوان نسل کے بیچ وہ کبھی اپنی عمر کی دیوار کو حائل نہیں ہونے دیتے۔ ڈاکٹر مجید مضمر ایسے ہی ایک تجربے سے واقف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"نوجوان نسل کے ساتھ وہ (حکیم منظور) جس طرح پیش آتے ہیں اُس سے لگتا ہے کہ انہیں لڑکپن اور جوانی کے دنوں میں گزر کر لینے کا لپکا ہے اور جس شخص میں یہ تمنا زندہ ہے وہی شخص زندہ ہوتا ہے۔"

حکیم منظور کی شخصیت میں اگر ایک طرف خودداری، غیرت، انسان دوستی اور انسانی ہمدردی کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں تو دوسری طرف فکری آزادی کی شمع بھی روشن ہے۔ جسکے بغیر انسان معراج کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ انہی عناصر نے انہیں غرور سے بچا کر منسکر المزاج بنا دیا اور ان کی شخصیت میں نفاست، متانت اور سنجیدگی پیدا کی ہے۔ اُن کی طبیعت کی خودداری اور متانت انکو آزرومند اور رواں دواں بناتی ہے۔ یہی آرزومندی انکو ہر وقت نت نئی دنیاؤں کی کھوج میں سرگرداں رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ حکیم منظور نے موقعہ پرستی کو کبھی بھی اپنی زندگی کا شعار نہیں بنایا۔ ذاتی اغراض و مقاصد کیلئے انہوں نے کبھی بھی اقتدار یا رسوخ کا غلط استعمال نہیں کیا کیونکہ یہ ان کے مزاج کے بالکل منافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

میں چاہتا خود پہ اوڑھ لیتا تراوتیں بہتے پانیوں کی
سوال درپیش تھا تو وہ صرف میرے اپنے مزاج کا تھا

!...... مجید مضمر۔ رنگ باتیں کریں۔ ص۔ ۹۳

حکیم منظور کی شاعری کا بغور جائزہ لینے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ انکے نوکِ قلم سے کچھ ایسے اشعار بھی نکلے ہیں جن میں کہیں نہ کہیں اُن کے اندر پنپ رہے غرور کے جذبے کی آمیزش جھلکتی ہے۔ حالانکہ ظاہراًان کی شخصیت میں انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ البتہ خود ہی اپنی انا پرستی کے بارے میں لکھتے ہیں:

میں خود ہی اپنی انا کا اسیر تھا منظور
مزاج اُس کا مجھے راس کیوں نہ آسکتا

میری انا، میرا جنون، میں مطمئن اس پر کہ ہوں
خود دھوپ خود ہی سائباں ، اللہ بس باقی ہوس

حکیم منظور کے کلام سے چند ایسے اشعار جن میں غرور وتکبر کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

اکثر خود بھی سوچتا ہوں میں میرا کوئی متبادل ہے
میرے گرد طواف میں کتنے چاند اور سورج رہتے ہیں

میں ہوں ایسی اک سچائی جس کے آگے باقی سب
یا تو فریبِ نظر ہے کوئی یا سرتاسر باطل ہے
جس کو پانے کیلئے لوگوں کی دستاریں گریں
وہ خزانہ جس جگہ بھی تھا مرے قدموں میں تھا

حکیم منظور جاذب نظر شخصیت کے مالک ہیں۔ لبوں پر خوشنما اور دلفریب مسکراہٹ اور چہرے پر حیا کا پرتو ان کی شخصیت کی شرافت ظاہر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں:

''فکر کی ہمہ گیری ، ذہن کی شادابی ، معاملہ فہمی اور نکتہ رسی کی

خصوصیات سے حکیم منظور کی شخصیت کا ہیولیٰ بنتا ہے۔ان کی شعری کائنات پر مذکورہ محاسن کے آثار جا بجا نظر آتے ہیں۔رنگ گندمی، آنکھیں نیم احمریں لیکن بیضوی، قد و قامت ایطاً جلی، لہجہ میں تمکنت کے ساتھ ساتھ کبھی تحکمانہ انداز، چہرے پر حیا اور قلم میں وفا۔ان سے مل کر میرا ہمیشہ یہی تاثر رہا ہے......

......ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں"[1]

حکیم منظور ایک زمانہ ساز شخصیت ہے۔وہ اپنی شاعرانہ خوبیوں سے بخوبی واقف ہیں۔خود اس بات کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔

ہاں صبح کی آیت ہوں تلاوت کیلئے ہوں
ہاں مجھ کو یقین ایک زمانہ ہے میرا بھی

اس اعتراف کے باوجود بھی حکیم صاحب کو اپنی کتاب آگہی بے عبارت محسوس ہوتی ہے۔وہ اپنے شاعرانہ قد کا بھی اندازہ کرنے۔سے قاصر ہیں۔چنانچہ لکھتے ہیں:

کیسے میں نے سات دریا کر لئے ہوں گے عبور
بے عبارت ہے ابھی میری کتاب آگہی

میرا قد کیا ہے کہاں مجھ پر کھلا
میں کروں منظور کس کی ہمسری

حکیم منظور کی شخصیت میں شائستگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اس بات کا اندازہ روبرو ملاقات کے علاوہ ان کی شاعری سے بھی ہوتا ہے۔مثلاً

میں کیسے منظور توڑ دوں شائستگی سے رشتے
میں کعبۂ دل کا چھوڑ دوں کیسے طواف کرنا

[1]......ڈاکٹر بشیر احمد نحوی۔'پھول شفق آنگن کے'، تبصرہ۔ص۔ا

طنز وظرافت حکیم منظور کی شخصیت کا خاصا ہے۔ وہ ہر پل اپنے احباب کے ساتھ شوخی وظرافت میں محو نظر آتے ہیں لیکن ایسے معاملات میں بھی وہ تہذیب وشائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ حکیم منظور کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے دوستوں کے علاوہ وہ غیروں کو بھی اپنا دوست تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک شعری مجموعے 'برف رُتوں کی آگ' کو ایسے ہی دوستوں کے نام انتساب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اُن دوستوں کے نام جو میرے دوست ہیں اور جن کا میں دوست ہوں اور اُن دوستوں کے نام جو میرے دوست نہیں"۔[1]

حکیم منظور کی شخصیت کا اہم پہلو مذہبی اور دینی معاملات سے اُن کی گہری دلچسپی ہے۔ عشقِ رسولؐ نے ان کی شخصیت کو مضبوط و مستحکم بنا دیا ہے۔ ذکرِ رسول اُن کیلئے روحانی غذا کا کام کرتا ہے۔ انہوں نے ایسے خیالات و تجربات کو بہت حساس اور مفکرانہ انداز میں برتنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ حکیم منظور کو با عمل اور فعال بنانے میں ایسی ہی کامیاب کوششوں کا عمل دخل ہے۔ لبوں پر ذکرِ رسولؐ آتے ہی حکیم منظور کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آتا ہے۔ یہ اُن کے سچے مسلمان ہونے اور پختہ ایمان کی نشانی ہے۔ اپنی شاعری کے آئینے میں وہ ایک عاشقِ رسولؐ کی حیثیت سے نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

اکثر و بیشتر اقدارِ صالحہ کا پہلا سبق بچے کو اپنے والدین ہی سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے پہلے نوالے کے ساتھ ہی اُسکی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ حکیم منظور کی شخصیت کی تشکیل میں اُن کے والد کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ متعدد جگہوں پر انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

1...... حکیم منظور۔ برف رتوں میں آگ

بے ثمر ہو کر سبھی نظروں میں حرفِ شب ہوا
ہاں مگر بوڑھا شجر میرے لئے مکتب ہوا

اس شعر میں جس بوڑھے شجر کا ذکر ہوا ہے اور جو اپنی گم گشتہ شاخوں اور سرسبز ماضی کی ایک اجڑی یادگار ہے وہی بوڑھا شجر شاعر کیلئے صحیفۂ فطرت کا عرفان حاصل کرنے کا مکتب ہے۔ یہ یقیناً حکیم منظور کے والد گرامی کی ذات کی طرف اشارہ ہے جو حکیم منظور کے لئے مکتبِ اول ثابت ہوئے ہیں۔ جہاں سے اُن کی شخصیت کے مختلف عناصر کی تشکیل و تربیت ہوئی ہے۔ قاضی غلام محمد حکیم منظور کے مندرجہ بالا شعر کو بنیاد بنا کر وضاحت فراہم کرتے ہیں۔

''پرانی قدروں کی امین یہ معمر ہستی ایک زندہ روایت Living Legend تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بوڑھا شجر ہمارے شاعر کا مکتبِ اول رہا ہوگا اور اسی مکتب سے ہمارے شاعر نے اقدارِ صالحہ کی پیروی اور پاسداری کا سبق حاصل کیا ہوگا۔''[1]

حکیم منظور ایک ذمہ دار شخص ہیں۔ اپنے فرائض سے منہ نہیں موڑتے۔ وہ دور رس اور دور اندیش بھی ہیں۔ اپنی گھریلو زندگی میں وہ کامیاب نظر آرہے ہیں۔ ناسازگارئ صحت کو بھی انہوں نے ادبی راہوں میں حائل نہیں ہونے دیا ہے بلکہ آنکھوں کے مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ پڑھنے لکھنے کا کام بڑے انہماک اور تواتر کے ساتھ کرتے رہے۔ حکیم منظور دکھ یا تکلیف میں بھی خدا سے گلہ شکوہ نہیں کرتے بلکہ قدرت کے اٹل فیصلوں پر تن بہ رضا رہتے ہیں۔ آنکھوں کے مرض میں مبتلا ہونے پر وہ یوں لکھتے ہیں:

مجھے آشوبِ آنکھوں کا ہے لاحق سخت عاجز ہوں
اسے بھی کہیئے اے منظور مولا کی مہربانی

---

[1]...... قاضی غلام محمد۔ پیش لفظ۔ 'پھول، شفق آنگن کے' (حکیم منظور) ص ۳

زمانے کی بدلتی قدروں سے موجودہ دور کا انسان عجیب کشمکش میں مبتلا ہے اور وہ ایسی صورت حال سے دوچار رہتا ہے جہاں وہ کسی صورت مطمئن نظر نہیں آتا۔ زندگی کا بڑھتا ہوا تناؤ جہاں انسانی ذہن و دل کو ان گنت وسوسوں سے ہمکنار کرتا ہے وہیں زندگی سے بیزار اور بددل بھی کر دیتا ہے۔ حکیم منظور بھی عصرِ حاضر کی زندگی کی الجھنوں، پیچیدگیوں اور ذہنی انتشار میں جینے والا ایک شخص ہے جو محدود دائروں میں رہتا تو ہے لیکن اپنے ہی خول میں سمٹ جانے کا ذرا بھی خدشہ نظر نہیں آتا۔ راقم کو کئی بار حکیم منظور کے ساتھ شرفِ ملاقات حاصل ہوا اور اس بات کا اندازہ ہوا کہ اُنکی شخصیت میں کسی قسم کا تناؤ یا انتشار نہیں۔ مجید مضمر صاحب اُن کی ذات پر دلالت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اُن کی (حکیم منظور) ذات ایک ایسا گھاٹ ہے کہ جس پر شیر اور بکری دونوں ایک ساتھ پانی پیا کرتے ہیں۔"[1]

خود اپنے بارے میں وہ رائے رکھتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجئے

ہم نے اے منظور ابھی تک یہی نہ جانا کون ہیں ہم
اتنا یقین کافی ہے شاید ہم جیسے ہیں اچھے ہیں

منظور اپنی ہستی سب سے اونچی ہے
اس کو کمتر سمجھنا ہے ایمان بڑا

لیکن کہیں کہیں وہ اپنے اندرونی انتشار کو چھپانے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کے چند اشعار بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔

دیا ہے ہنسنے کا فن میں نے اپنے رونے کو
ہوں ورنہ آپ سا منظور دل حزیں میں بھی

---

[1]...... مجید مضمر۔ رنگ باتیں کریں۔ ص ۹۴

ہوں سمندر کا میں ہم سخن، میری آنکھ تر میری بات نم
میں سکوں تمام ہوں ظاہراً کوئی کربلا میرے ساتھ ہے

خوشیاں سب کے ساتھ منانے والا میں
اور اکیلے اپنے سب دکھ سہنے کا

ایسی کیفیات کے اظہار کے باوجود انہیں اطمینان وسکون کی نعمت حاصل ہے۔ وہ زندگی سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ مشاعروں کی دعوت کو وہ اکثر قبول نہیں کرتے لیکن اس عمل سے کبھی اُنکی خود داری اور خود پرستی مراد نہ لی جائے وہ دراصل Replacement کے قائل ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"اگر ہر کہنہ مشق شاعر ہر ایک چھوٹے بڑے مشاعرے میں شریک ہوگا تو نئے شعراء کیلئے کوئی موقعہ کیسے فراہم ہوسکتا ہے۔ نو آموختہ شعراء کیلئے ہمیں ہی ایک پلیٹ فارم فراہم کرنا ہے۔ رہی شعروادب کی خدمت وہ تو گھر بیٹھے بھی ہوسکتی ہے۔"[1]

حکیم منظور پرسکون ماحول کے طلبگار ہیں۔ انہیں بھیڑ بھاڑ اور ہنگامہ آرائیوں سے سخت نفرت ہے۔ انہیں اپنا گھر کسی گوشۂ عافیت سے کم نظر نہیں آتا۔ وہ لکھتے ہیں:

ہنگامہ منظور نہیں میرا حصہ
ایک سکوں کا گوشہ مجھ کو گھر میرا

حکیم منظور شعر وادب کے علاوہ صحافت کے میدان میں بھی اپنی خدمات فراہم کررہے ہیں۔ نئی نسل کی شعری تربیت میں بھی کبھی کسی کوتاہی سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنے اخبار 'خبر ونظر' میں نو آموز شعراء کا کلام چھاپ کر اُن کی حوصلہ افزائی

[1]...... ایک انٹرویو

کرتے ہیں۔ وہ مصلحتوں پر یقین نہیں رکھتے اور مادی آسائشوں کی آلائشوں سے بھی دور ہیں۔ جسکا ایک اہم ثبوت ان کے شائع کردہ اخبار کی وہ کاپیاں جو زیادہ تر مفت ہی تقسیم ہوتی ہیں۔ آجکل کی مادی زندگی میں اس طرح کا گھاٹے کا سودا حکیم منظور کی شخصیت کے ایک انوکھے پہلو کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ انکے پورے کلام کے مطالعے کے بعد ان کی ہمہ جہت شخصیت کے کئی اور پہلو واضح طور سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

رخ دوسرا مجھ پھول نفس کا نہیں منظور
مجھ برف کے پالے کو ہے برسات طلسمات

تھا نہ دنیا ساز بھی میں سادہ لوح ایسا بھی تھا
دوستی بادل سے کرلی دشمنی دریا سے کی

یہ میرا مقدور اگر ہو، سب سوئے ہوں میں چپکے سے
گھر گھر کے آگے رکھ آؤں نئے نئے پھولوں کا آنگن

بس اِک لفظ پیار کا میں جاں لٹاؤں گا
اِک سایۂ ملال پلٹ کر نہ آؤں گا

خوشبو چاہے کتنی ہی مستانی ہو
کبھی نہ اپنی حد سے گزرنے والا میں

یہ میری خامی بھی ہے اچھائی بھی
اپنی سچی بات پہ اڑنے والا میں

اپنے باہر سے جیسا ہوں ویسا ہوں
اپنے اندر سے اک لڑنے والا میں

سورج اتنا اونچا ہوکر بھی منظوؔر
ہر خوشبو کے پاؤں پڑنے والا میں

حکیم منظور بے لوث شخص ہیں۔ کبھی بھی اپنے ذاتی مفاد کیلیئے انہوں نے کسی کی خوشامد نہیں کی۔ شعری خدمات کے صلے میں اُن کی حق ادائی میں کوتاہی برتی گئی۔ جسکی شکایت وہ شاعرانہ انداز میں کچھ اسطرح کرتے ہیں:

اک صبح کی آیت سا منظور عبارت ہوں
افسوس اُسے اب تک سمجھا ہی نہیں کوئی

حکیم منظور کی غزل گوئی

حکیم منظور نے اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۴ء میں کیا۔ اب تک ان کے گیارہ شعری مجموعے چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ جن میں دو شعری مجموعے کشمیری زبان میں ہیں۔ ان کے تمام تر مجموعے کئی حوالوں سے اردو کی شعری دنیا میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح ان کے شعری مجموعوں کے نام تازہ اور نئے ہیں اسی طرح ان کے اندر بسی شعری دنیا تازہ، اَن دیکھی اور نامانوس ہے۔ حکیم منظور کا شعری سفر تجربات کے عمدہ اظہار، لفظ و معنی اور ہیت و موضوع کے مناسب استعمال سے ایک جہانِ تازہ کا سفر ہے جسکی تخلیق کرتے وقت شاعر اپنی داخلی آویزشوں پر فنکارانہ شعور سے غالب آجاتے ہیں۔ زبان و بیان کی تراشیدگی اور تخیل کی تزئین کاری میں وہ ہمیشہ جدت کاری سے کام لیتے ہیں۔

حکیم منظور نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اردو میں جدیدیت کا رجحان زوروں پر تھا۔ انفرادیت کا تحفظ اس رجحان کا اصل مقصد تھا اور اس کا طریق کار ترقی پسندی اور روایت سے انحراف کر کے ایک نئی شعری صورت حال کی تشکیل قرار پایا گیا تھا۔ چنانچہ جدیدیت کا انفرادیت پسند رجحان جماعتی شاعری کا موجب بن گیا۔ آج جب کہ اردو کی جدید شاعری کا بیشتر حصہ تقلید و تکرار کی وجہ سے یکسانیت کی فضا کا احساس دلاتا ہے۔ حکیم منظور کی شاعری اپنی ایک الگ شناخت قائم کر چکی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک الگ رنگ و آہنگ ہے جس کی وجہ سے وہ اردو کے جدید شعراء کی صف میں آگے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر مجید مضمر لکھتے ہیں:

'وہ بلاشبہ اردو کے ان جدید شاعروں میں شامل ہے جنہیں اپنی تخلیقی توانائی اور لسانی قدرت کی بنا پر انفرادیت کا حوالہ مل گیا۔ حکیم منظور کو

شروع ہی سے بے تصنیف حرف لکھنے کی آرزو تھی۔ مختلف رنگوں کا
بازار سجا تھا اور اس میں اپنے منفرد رنگ کا اثبات ہی ان کے تخلیقی
وجود کا جواز ہوسکتا ہے۔[1]

اردو کی جدید شاعری کا جائزہ لینے سے معلوم ہوگا کہ ایک وقت کے بعد اس میں اندھادھند تقلید کے باعث یکسانیت کی فضا پیدا ہوگئی۔ حکیم منظور نے جدیدیت کی تحریک کو یکسر مسترد کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس یکسانیت کی فضا سے الگ وہ اپنی شاعری کی مکمل شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حکیم منظور اپنی خود کی بنائی ہوئی راہوں پر سفر طے کرنا چاہتے ہیں۔ تقلیدی راہوں پر چلنا ان کیلئے کسی عذاب سے کم نہیں۔ وہ متواتر سفر کے لئے ان دیکھے میدان کی تمنا کرتے ہیں۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں۔

سو بار کی چلی ہوئی راہیں عذاب ہیں
پاؤں کے اضطراب کو میدان چاہیے

منظور لفظ لکھوں تو ایسے کہ سب لکھیں
اک فرق صرف یہ کہ معانی جدا لکھوں

حکیم منظور کے مندرجہ بالا اشعار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ شاعر تخیل کی وسعتوں میں نئے افکار و الفاظ کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ان کے پہلے مجموعے 'ناتمام' ہی سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں۔ روایت سے انحراف کا یہ عمل بعد کے مجموعات میں شدید ہوتا جاتا ہے۔ اور یہی ان کی شناخت کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ حکیم منظور روایت سے انحراف کے حق میں تو نہیں لیکن روایت کا انہوں نے ہمیشہ احترام کیا ہے۔ گو کبھی اپنے اوپر حاوی ہونے کا موقعہ نہیں دیا۔ مجید مضمر لکھتے ہیں:

[1]......ڈاکٹر مجید مضمر۔ رنگ باتیں کریں۔ ص ۹۶

'انہوں نے (حکیم منظور) روایت کا احترام تو کیا لیکن اسے پاؤں کی زنجیر بننے نہیں دیا۔ بلکہ جب تجربے کی ترسیل میں روایت کا ملبوس مانع آیا تو اسے انحراف کر کے لسانی تشکیل سے بھی کام لیا'۔ [1]

روایت سے انحراف کے بعد حکیم منظور جہاں اپنے لئے ایک منفرد راستہ ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوئے وہیں فکر و معنی کی گہرائی اور گیرائی نے ان کے کلام کو ایک اچھوتا رنگ بھی عطا کیا۔ اس سلسلے میں عبدالمغنی لکھتے ہیں:

'حکیم منظور کے کلام میں فکر، تجربے اور احساس کا اظہار ایک انفرادیت کے ساتھ ہوا ہے، اس لئے کہ شاعر رہِ عام سے ہٹ کر چلنے کا عادی ہے۔ وہ رسمی خیالات کا روایتی انداز سے ابلاغ پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں دقیقہ بینی اور معنی آفرینی نمایاں ہے۔' [2]

حکیم منظور جگہ جگہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ تقلید کے پابند نہیں ہیں۔ انہی کا ایک شعر ملاحظہ ہو

میں کہ تقلید کا پابند نہیں ہوں منظور
ہر غزل میری نئی سوچ کی تفسیر کہ تھی

روایتی ڈگر سے ہٹ کر وہ غزل کو نئی سوچ دینے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور اس کوشش میں وہ اچھوتے الفاظ گڑھتے ہیں لیکن لفظ سازی کا یہ عمل ان کیلئے کسی امتحان سے کم نہیں ہوتا۔ لفظوں کی مرصع سازی کے بعد لفظ پرستی کا عمل شروع ہوتا ہے جہاں وہ لفظوں کے بت بنا کر انکو پوجتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

بناتا پوجتا منظور ہوں لفظوں کے بت کتنے
میری جیسی ہی مجبوری رہی ہوگی جو آذر کی

---

[1]۔۔۔۔۔ مجید مضمر۔ رنگ باتیں کریں۔ ص ۹۷

[2]۔۔۔۔۔ تبصرہ۔ خوشبو کا نام نیا۔ عبدالمغنی

حکیم منظور تخلیقی عمل کی ماہیت سے آگاہ ہیں۔یہی عمل انکو ایک منفرد حیثیت عطا کرتا ہے۔راج نرائن راز لکھتے ہیں:

'حکیم منظور کے یہاں جداگانہ فکری سطح پر الفاظ کے تخلیقی استعمال کی ایک علامت تجریدی تمثیل ہے جو بیک وقت اس کے اندازِ مشاہدہ اور اسلوب کا حصہ ہے۔'[1]

حکیم منظور اپنے ایک شعری مجموعے 'خوشبو کا نام نیا' کی آخری غزل میں اپنے تغزل کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

تہہ در تہہ معنی کا دفتر میری غزل
ہر منظر کی آنکھ کا منظر میری غزل
لفظ، معنی ، لہجہ اس کا انجانا
اسی لئے گھر میں بھی بے گھر میری غزل

مندرجہ بالا اشعار حکیم منظور کے تنقیدی شعور کی غمازی کرتے ہیں۔وہ اپنے کلام میں پوشیدہ خوبیوں سے بھی واقف ہیں۔چاہے وہ معنی کے دفتر ہوں یا پھر آنکھ کے مشاہدات کا منظر۔ان کا شعری اسلوب ذات و کائنات دونوں پر محیط ہے۔ اپنے کلام کے ذریعے انہوں نے اردو شاعری کو جو نیا لہجہ اور تازہ لفظ و معنی عطا کئے ہیں کوئی ضروری نہیں کہ ہر قسم کے قارئین ان سے یکساں طور پر لطف اندوز ہوں۔ بلکہ یہ ممکن ہے کہ ایک خاص طبقہ ان کے کلام میں کسی اجنبیت کا سا احساس کرتے ہوں۔لیکن اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ حکیم منظور کے اشعار اپنا ایک خاص مفہوم رکھتے ہیں اور فکر انگیز ہیں۔ان کے کلام میں جہاں ان چھوئی، نئی اور تازہ خوشبوؤں کا احساس ملتا ہے۔ وہیں روایتی شعری چاشنی بھی موجود ہے۔ان کے شعری ذخیرے میں ہر قسم کے قارئین کے ذائقے کا سامان میسر ہے۔یہی وجہ ہے

۱.....شیرازہ۔جموں وکشمیر اردو ادب نمبر۔ص ۱۶۱

کہ ان کی شاعری قارئین کے ہر حلقے میں پسند کی جاتی ہے۔ شمیم حنفی اس بات کی تائید میں لکھتے ہیں:

'حکیم منظور کی شاعری نئے اور پرانے رنگوں کی آمیزش کے سبب مختلف حلقوں کیلئے یکساں اپیل رکھتی ہے اور عام حد بندیوں کو قبول نہیں کرتی۔[1]

حکیم منظور نے جس دور میں غزل کی آبیاری شروع کی۔ اس دور میں شاعری کی تعمیرِ جدید کا کام ہو رہا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ریاستی سطح پر شاعری کو معنی آفرینی عطا ہو روایتی الفاظ، استعاروں اور علامتوں سے دامن چھڑایا بھی جائے۔ لیکن متبادل علامات واستعارات یا لفظیات کے وہ ذخائر شاعری کو عطا کئے جائیں جو اسکے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہوں۔ حکیم منظور نے اس سلسلے میں اپنا بھرپور تعاون دیا ہے۔ محمود ہاشمی لکھتے ہیں:

'اس عہد کی غزل کو جس تحیر، اضطراب اور خاموشی سے الفاظ تک سفر کرنے والی مفہوم کی تہہ دار تلوار کی ضرورت ہے وہ سب حکیم منظور کے اشعار کا سرمایہ ہے۔'[1]

خود حکیم منظور کے ہی ایک شعر سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

خود روایت ساز ہوں میں اس لئے مانوں گا کیا
سر بھی ہو میرا ہی اے منظور تیشہ بھی مرا

حکیم منظور نے روایت سے قدرے لاتعلقی برت کر اپنی ایک الگ راہ نکال لی مگر ان کی شاعری میں جدیدیت کے منفی رجحانات راہ نہیں پا سکے۔ ساتھ ہی روایت کے غیر فطری رنگوں کا بھی کوئی عکس ان کی شاعری میں دکھائی نہیں دیتا۔ راج نرائن راز ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

[1]...... شیرازہ۔ جموں وکشمیر میں اردو ادب نمبر۔ ص۔ ۱۶۱

"منظور کی شاعری کی مثال پر زم (Prism) جیسی ہے۔ عصری فکر
واحساس کی ست رنگی چھوٹ پڑنے سے وہ مابعد عصر کی شاعری معلوم ہوتی
ہے۔'[1]

حکیم منظور اپنے پہلے ہی شعری مجموعے 'ناتمام' سے ادبی حلقوں میں متعارف ہو گئے۔ ان کی خاص پہچان جو ان کی انفرادیت کی بقا ہے انکا انوکھا اسلوبِ بیان ہے۔ جو ان سے قبل کی شعری دنیا میں مفقود ہے۔ ان کی شاعری ایک خاص احساس، خاص تاثر اور عصری آگہی کی حامل ہے۔ ان کی شاعری روایت سے انقطاع کی نہیں بلکہ روایت کی توسیع کی شاعری ہے۔ روایت کو نیا شعری آہنگ دینا ہی ان کی انفرادیت ہے۔ غلام رسول ملک رقمطراز ہیں:

'حکیم منظور کو اگر کسی مخصوص شعری روایت کے ساتھ منسلک
کرنا ہو تو وہ وہی روایت ہے کہ جہاں ایک متجسس، مسلسل،
فعال اور طاقتور ذہن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔'[2]

حکیم منظور اس بات کی آگہی رکھتے ہیں کہ آنگنوں کی سایہ سیرابی کیلئے تازہ شجر کاری از حد ضروری ہے۔ اور یہ بات بھی وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ان کے ہم عصر شعراء زمانے کی کروٹ کو محسوس کر چکے ہیں اور تازہ دم حقائق سے بھی باخبر ہیں۔ لیکن روایتی ڈگر کو وہ ترک نہیں کر سکتے۔ ان کی زبان کو بوڑھی کہاوتوں کا چسکا لگ چکا ہے:

نہیں کہ وہ تازہ دم حقائق سے بے خبر ہے
زبان کو چسکا لگا ہے بوڑھی کہاوتوں کا

حکیم منظور ایک صاحبِ اسلوب شاعر ہیں۔ ان کے فکر و احساس کا سرچشمہ ان کی دھرتی کی اعلیٰ تمدنی، تہذیبی اور علمی روایات ہیں۔ انہوں نے کشمیر اور کشمیریت کے

۱...... صبح شفق تلاوت۔ پیش گفت۔ راج نرائن راز ص۔ ۹

۲...... ناتمام۔ غلام رسول ملک۔ ص۔ ۲

نقوش کو کمال سادگی سے علامتوں کے طور پر استعمال کیا اور انہیں مقامی سے آفاقی بنادیا ہے اور یہ عمل ان کی منفرد شاعری کی پہچان ہے۔

جہاں تک منظور کی غزل کی لے کا تعلق ہے یہ روایتی غزل کی لے سے قطعی طور پر مختلف ہے۔غزل کی لے ہی نہیں بلکہ اس کی فکری سطح بھی روایتی انداز سے قدرے مختلف ہے۔ان کی فکری سطح کشمیر کی یخ بستہ فضاؤں کے پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ یخ بستہ فضائیں اپنے اندر ایک طرح کی سفاکیت اور مبارزیت کا عنصر لئے ہوئے ہیں۔ حکیم منظور کی شاعری میں جو تراکیب اور تلازمے استعمال ہوئے ہیں وہ قدرت کی سفاکیت اور مبارزیت کے آئینہ دار ہیں اور ان کی شاعری اسی تضاد اور تصادم کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ چند تلازمات اور انسلاکات ملاحظہ ہوں:

ٹھٹھری ہوئی ہوا، بجھتے الاؤ، کالے پتھروں کے پہاڑ، کہر آلودہ نظر، برف سی رات، سیب جیسی صورتیں، یخ بستہ خیال، خوفِ رخِ دشمن جاں، سیہ صبح، سکوت صحرا، سرابوں سے پیار، مہمل کاغذی الفاظ، تیشۂ تعبیر آئینہ، پتھر کا خواب، دشت دشت برستا سحاب، دست سنگ، آئینہ گرفتہ، آئینہ چمکتے آفتابوں کا وغیرہ وغیرہ۔اس سلسلے میں چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

لفظ بجھتے رہے یخ بستہ خیالوں میں کہیں
ہے زباں زخم کہ میں شعلہ بیانی سے گیا

میں نے اچھا ہی کیا توڑ کے آئینے کو
اب تو میں خوفِ رخِ دشمنِ جانی سے گیا

برف سی رات، سیہ صبح، سکوت صحرا
یہ سبھی کچے تصور کسی بے گھر کے ہیں

ایسے تلازموں اور انسلاکات سے ان کی غزلیات میں ایک انوکھی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ جو معاصرِ شعراء کے ہاں ناپید ہے اور اگر کہیں اس طرح کے تلازمے اور انسلاکات ان کے استعمال میں آئے بھی ہیں تو وہ روایتی انداز ہی میں برتے گئے ہیں۔ جب کہ حکیم منظور کے ہاں ایسا نہیں ہے یہاں شاعر قاری تک اپنے احساس کو بحسن وخوبی پہنچانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ مسعود منور کے نزدیک ان کی شاعرانہ تراکیب انکو اپنے ہم عصروں سے کہیں اونچا قد بخشنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

'انہوں نے (حکیم منظور) ارضِ سیب کی اخروٹ نکہتوں، سکوتِ برف شبی، نزول آفتاب، آفتابوں کا بڑھاپا، برف ملبوس، برف کا بستر، سلگتی برف جیسی ترکیبیں وضع کر کے جہاں اپنے مقامی رنگ کو نمایاں کیا ہے وہاں غزل کے پیکر کو ایک تازہ تر، ایک بالکل منفرد، ایک غایت درجہ انوکھا ملبوس بھی دیا ہے۔'[1]

یہ دراصل ترسیل کے عمل کا کرشمہ ہے اور یہی کرشمہ حکیم منظور کے آہنگ اور اسلوب کا بنیادی وصف ہے۔ یہ اسلوب اور آہنگ دراصل کشمیریت کی دین ہے جو کہ ایک خاصے کی چیز ہے اور شاعر کو ایک نیا مرتبہ ومقام عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ایک خاص احساس، خاص تاثر اور عصری آگہی کی حامل ہے۔ کشمیر کا قدرتی حسن ان کے کلام میں اپنا بھرپور جلوہ دکھاتا نظر آتا ہے۔ راج نرائن راز اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

[1]...... مسعود منور۔ صبح شفق تلاوت۔ (مجموعہ شعر حکیم منظور)۔ سرورق

'ان کے ہاں (حکیم منظور) جو وسعت اور کشادگی ہے وہ کشمیر کے ماحول میں پیوست انسلاکات اور تلازموں کے موثر اظہار سے عبارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں مختلف رنگوں کی ریل پیل ہے۔'[1]

''لہولمس چنار'' کی غزلیں الفاظ، اسلوب اور افکار کا یکسر مختلف منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔ شاعر کشمیریت کا شدید تاثر بھرپور انداز میں پیش کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ اخروٹ نکہتوں کا احساس کرانا حکیم منظور کا ہی شعری وصف ہے۔ وہ ایک سچے شاعر کی طرح برہنہ صداقتوں کو تحریر کرتے کبھی نہیں ہچکچاتے۔ حکیم منظور اپنی شاعری میں نت نئے تجربات چاہتے ہیں۔ یکسانیت سے انہیں بوریت ہوتی ہے۔ وہ ہر قدم پر نئے چیلنج قبول کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ یہ سچ جانتے ہوئے بھی کہ ان کی شبنمی ذات آفتاب کے مدمقابل کھڑی ہے اور ایسے بادِ مخالف کے تند جھونکوں میں اپنا وجود برقرار رکھنا اور اپنی شناخت قائم کرنا کسی بڑے چیلنج سے کم نہیں۔

حکیم منظور نے اَن چھوئے نقوش کی دنیا آباد کی ہے۔ ان کی شاعری میں پہلی نظر خلاقانہ تاب کاری، متجسس اندازِ مشاہدہ اور استفسارانہ لہجہ، نامانوس لفظیات اور تلازمات پر پڑتی ہے۔ کلام میں ان سب ہی کی موجودگی ان کی انفرادیت برقرار رکھتی ہے۔ جس کا فقدان تقلیدی روش سے ہٹنے والوں کے ہاں شدت سے نظر آتا ہے۔

حکیم منظور کے ہاں کشمیریت اور کشمیری ماحول اور موسمیاتی عمل اپنی سفاکیت کے ساتھ پوری طرح جلوہ گر ہے۔ موسمیاتی عمل اور اس کی سفاکیت کشمیری ماحول کا وہ جبر ہے جو شاعر کو سخت جانی کے عمل پر مجبور کرتا ہے۔ یہی سخت جانی ان کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

[1]......ناتمام۔ پیش لفظ۔ راج نرائن راز

حکیم منظور کے کلام میں ایک خاص بات جو قاری کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کراتی ہے وہ ان کی شاعری کی المیاتی کیفیات ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ کیفیت کچھ سیاسی اور کچھ موسمیاتی عمل کی دین ہو کیونکہ کشمیر عرصۂ دراز سے مختلف حالات وواقعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ کہیں کہیں جو گھٹن کا ماحول جلوہ گر ہے ممکن ہے کہ ان کی شاعری میں المیہ کیفیت کا عمل اسی نہ ختم ہونے والی گھٹن کے سبب ہو۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کوئی بھی بات کرے خود کو ٹوکتا ہوں میں
یہ کرب کیا ہے کہاں خود بھی جانتا ہوں میں

عجب طرح کا اذیت پسند ہوں میں بھی
تمام رات ہواؤں سے بولتا ہوں میں

خاموشیوں کے زرد تکلم کے ڈر سے وہ
اک ان سنی صدا کا طرفدار بن گیا

اداسیوں کا ہر اک بام و در پہ پہرہ ہے
نظر بچا کے چلو ورنہ جانے کیا ہوگا

حکیم منظور مختلف رنگوں کے قائل نہیں بلکہ اپنے تخلیقی وجود کو یک رنگی سے سجا کر منفرد ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ وہ منزل کی طرف بڑھنے کیلئے راستہ تراشنے اور اس پر تنہا چلنے کی تمنا رکھتے ہیں۔

میرے قدم نہیں اٹھتے ہیں باسی راہوں پر
میں راہ چلوں اپنی میں سفر کروں اپنا

حکیم منظور نے اپنے لئے جس الگ شعری ڈگر کا انتخاب کیا وہ نہ صرف اس پر کامیابی کے ساتھ گامزن رہے بلکہ اپنی انفرادیت کو بھی برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ حالانکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ایسے ماحول میں خود کو بچائے رکھنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ بہر حال ان کے کلام پر کوئی اور رنگ غالب نہ آسکا۔ اپنی انفرادیت کے تحفظ کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

قطرہ ہوں خود کو بچائے پھرتا ہوں
دریا کی دریا نوشی سے واقف ہوں

اس طرح تقلیدی روش کا بطلان ہی لسانی اور موضوعاتی دنیا بسانے کا موجب بنتا ہے۔ اب تک کی اردو شاعری میں ایسے تجربے کم ہی نظر آتے ہیں جہاں تخلیقی اظہار کو نئی جہت دینے میں شاعر کامیاب ہوئے ہوں۔ مجید مضمر رقمطراز ہیں:

'غزل کی عمومی منطق سے انحراف کے بعد انہوں نے (حکیم منظور) جو لسانی اور موضوعاتی کائنات پیش کی وہ عصری غزل کے تئیں نیا تعارف بھی ہے اور نیا تجربہ بھی۔ ان کے یہاں واقعی تخلیقی اظہار کی وہ صورتیں ملتی ہیں جن سے ہماری قرائتیں اب تک محروم تھیں'[1]

حکیم منظور کی شعری کائنات ان کی فکری ہمہ گیری ذہن کی تہہ در تہہ رسائی، نکتہ رسی، مشاہدے کی تازہ کاری، منفرد اسلوب اور موثر پیرائیہ اظہار سے مزین نظر آتی ہے۔ کسی دورائے کے بغیر وہ اردو کے ان جدید شعراء کی صف میں قد آور نظر آتے ہیں جو تخلیقی توانائی اور زبان پر قدرت کی وجہ سے منفرد نظر آتے ہیں۔

اردو شاعری کو برابر نئی تراکیب عطا کرنے میں حکیم منظور کا نام سنہرے حروف میں لکھا جاسکتا ہے۔ یہ ایسی تراکیب ہیں جن میں اضافت کا استعمال نہیں

[1]..... مجید مضمر۔ رنگ باتیں کریں۔ ص ۹۷

ہوا ہے۔ یہ شاعر کی انفرادیت کا پہلا رنگ قرار دیا جا سکتا ہے وہ ان وصفی تراکیب کے خوبصورت استعمال سے قاری کے ذہن کو سحر انگیز حد تک اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایجاز واختصار اور معنی کی تہہ داری انہی تراکیب کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ ساتھ ہی ایک منفرد استعاراتی نظام کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔ یہ تراکیب ان کے کلام کو حواس کی ہمہ سمتی، تجربوں کی ندرت اور معنی کی تہہ داری بھی بخشتی ہیں۔ حکیم صاحب کے ایک عزیز اور ان کے ہم عصر شاعر مظفر ایرج ایسی تراکیب کو قوسی تراکیب کا نام دیتے ہیں۔ مجید مضمر ان تراکیب کے حسن کے بارے میں رقمطراز ہیں:

'ان تراکیبوں کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ یہ متحرک، بصری،
سمعی، لمسی اور شامی پیکروں کی حیثیت بھی اختیار کر لیتی ہیں
اور قرأت کے ایک نئے تجربے سے روشناس کراتی ہیں۔'[1]

حکیم منظور کے کلام سے کچھ تراکیب بطور مثال پیش کی جا رہی ہیں۔ جن کے استعمال سے شاعر نے غزل کے پیکر کو ایک تازہ تر، منفرد اور غایت درجہ انوکھا ملبوس عطا کیا ہے۔

برف شب، قاف پری، برف پیڑ، ہوا زبان، برف خموشی، دھوپ زد، یخ شاخ، برف گل، لہو داغ، چاند کہانی، آسماں قد، چشم رنگ، دھوپ دن، سنگ بدن، خنک چاند، دھوپ بستر ا، سیراب بدن، لہو پوش، بادام صورت، ہوا ہاتھ، سیب صبح جبیں، ہوا زبان، برف شاخ، برف آنگن، زعفراں جبیں، ہوا پروں، دھوپ دن لہو لمس، برف گل، تازہ بدن، موسم بدن، ثمر شجر، مہتاب بدن، سرو بدن، شب آنگن، گل شفق، شیشہ بدن، دامن دھوپ، شفق پر، شفق بدن، خواب وادیاں، دھوپ بن، کانچ کھلونے، برف راتیں، دھوپ لمحے، گل چہرہ، برف پر، لہو آسودہ

[1]..... مجید مضمر۔ رنگ باتیں کریں۔ ص ۹۸

خنجر، شفق تلاوت، شفق صدا، سخن فرصتیں ، گجر ساعتیں ، لمس نوا ساعت، چنار چہرے، سنگ لذتیں ، خلا واقف، پھول نظریں، دھوپ دل آزاریاں، برف آنگن، ہوا تھالی، پھول وظیفہ، سورج مکان ہوا، دھوپ سواری، دریا روانیاں، دھوپ دیوتا، خوشبو سماعت، سنگ بدن رُت۔

یہ اور ایسی اور کتنی ہی تراکیب ہیں جو حکیم منظور کے کلام کا حسن نکھارتی ہیں اور کلام کو نئی جہتیں عطا کرتی ہیں۔ ان تمام تراکیب میں اضافت کا استعمال نہیں ہوا ہے اور انہی کے بنا پر حکیم منظور کی شاعری نہ کبھی یکسانیت کا شکار ہوئی ہے اور نہ ہی اکہرے پن کی۔ بلکہ مختلف ذائقے سے آشنا کرتی ہے۔ اردو غزل میں اس طرح کی وصفی تراکیب کا استعمال بانؔی کے ہاں ہوا ہے اس تجربے میں شاعر بانؔی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ بانؔی ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کے مشاہدہ نظر میں ایسی تراکیب آئی ہیں۔ اس سلسلے میں حکیم منظور خود اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آپ تو اب بھی شعر اچھا سا کہتے ہیں منظور مگر
سچ ہے آپ کے شعروں کا یار کھ راز ہے یا پھر بانؔی ہے

حکیم منظور کی انفرادیت کا دوسرا پہلو اپنے گرد و پیش سے ان کی وابستگی بلکہ دل بستگی کا زائدہ ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی جڑیں اپنی زمین میں بہت گہری ہیں۔ انفرادیت کا یہ پہلو کشمیریت کا وہ مقامی رنگ ہے جو صرف یہاں کی فطرت نگاری کا حوالہ نہیں بلکہ شاعر کے اظہارِ ذات کا ایک وسیلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ کشمیر کی اقامتی زندگی، یہاں کے بدلتے موسموں اور پھلوں پھولوں، مقامات اور اشیاء نے ان کی شاعری میں ایک ایسا منظر نامہ ترتیب دیا ہے جو اردو شاعری میں بجائے خود ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ شاعر کی داخلیت پسندی کا نتیجہ ہے کہ یہ مقامی رنگ کے بجائے زمین و زماں کی حدود سے لازمینی اور لازمانی کیفیات و محسوسات تک کے سفر کو محیط محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے

طور پر:

تمہارے آموں پہ کیا گزرتی ہے، جانتا ہوں
لہو ہیں اخروٹ میرے، موسم کی سازشوں سے

لکھا تھا سفیدوں کے ہر پیڑ پر
میں اونچا بہت مجھ میں سایا کہاں
ہوا ہی نہ بولے تو میں کیا کروں
لہو لمس ہوتے ہیں کیسے چنار

کوہِ ماراں کی تجلی دیکھ کر منظورؔ اب
روشنی کیا ہے مجھے اب کیا کوئی سمجھائے گا

حکیم منظور نے شاعری کی بنیاد جن عناصر پر رکھی ہے وہ بڑے جامع اور بلند ہیں۔فکری ہمہ گیری، ذہن کی تہہ در تہہ رسائی، نکتہ رسی، مشاہدے کی تازہ کاری، جداگانہ اسلوب اور موثر پیرائیہ اظہار حکیم کی شعری کائنات کی مبادیات ہیں۔بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں:

'میں نے جب جب ان کے اشعار پر غور کیا، نتیجے میں بس یہی استعارے ہاتھ آئے۔کھلے تو پھول، سمٹے تو رنگ، بکھرے تو خوشبو، اُبھرے تو چاند، چھٹکے تو چاندنی، چھلکے تو سرشاری اور......
اور نہائی، نکھری اور کھلتی ہوئی آنکھ کے ساتھ پھیلتی ہوئی کائنات۔'[1]

ان تمام استعارات سے بھی پرے کچھ ایسے رنگ ہیں جو نحوی صاحب کے

[1]......بشیر احمد نحوی۔خوشبو کا نام نیا (مجموعہ شعر۔حکیم منظور) سرورق

ہاتھ نہیں لگ سکے ہیں۔ جبھی تو حکیم منظور نے شاعرانہ لہجے میں ہی جواب دیا ہے۔
ملاحظہ کیجئے:

کھلے تو گل ، بکھرے تو چاندنی
یہ تعریف بھی، سیر حاصل نہیں

دراصل حکیم منظور کی انفرادیت استعارہ سازی سے بھی واضح ہے۔ اردو شاعری میں ایسے بہت ہی کم تجربے ہوئے جہاں ایسے واضح اور مکمل developed استعارے نظر آئیں گے۔ حکیم منظور چونکہ ایک حقیقی فنکار ہیں اس لئے انہیں ایسے استعارے گڑھتے وقت کسی میکنزم کا استعمال نہیں کرنا پڑتا بلکہ ان کے ہاں تو استعارے شعر کی خمیر میں پیوست نظر آتے ہیں۔ دراصل حکیم منظور کا اندازِ بیان ہی استعاراتی ہے اور ایک مستند تخلیقی فنکار کی طرح ان کے پاس اپنی شخصیت، اپنا زاویہ نگاہ اور اپنی حسیت ہے۔ اسی انفرادیت اور ندرتِ فکر ونظر ہی سے ان کے ہاں ذہن کی کارفرمائی اور جذبات واحساسات کی فراوانی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کے ہاں جاذبیت، فکر ونظر کو مالا مال کرنے کی قوت کے ساتھ ہی ساتھ انسانیت سازی کی صلاحیت بھی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی ادب کے ذخائر میں حکیم منظور کی شاعری زندہ اور متحرک نظر آتی ہے۔ چند اشعار بطورِ مثال پیش ہیں۔

مجھ کو لفظوں میں چھپنے کی عادت نہیں
میرے دل پہ زبان کی حکومت نہیں

اپنا دل کھولا ہے میرے سامنے ہر لفظ نے
میں سنوں کس کی مجھے اب کون کیا سمجھائے گا

حکیم منظور کے تکلم میں جدت اور اظہار میں نئی ادا ہے جو الفاظ، پیکر، علامتیں اور استعارے وہ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں معنی و مفاہیم کی سلابتیں اجنبی اجنبی سی ضرور لگتی ہیں لیکن شاعر کو اپنی شعری زبان پر بھر پور اعتماد ہے۔ حکیم منظور کے ہاں اکثر اشعار میں استعارہ در استعارہ کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ مندرجہ ذیل شعر بطور مثال پیش ہے۔

اسکی صدا سے گونگے لمحے پایل جیسے بجتے ہیں
بچوں جیسا خوش ہوتا ہوں جب بھی بارش ہوتی ہے

اس شعر کا دوسرا مصرعہ ایک نادر جذباتی تاثر کا بے ساختہ اظہار ہے اور پہلا اس تاثر کے بطن سے پیدا ہونے والی ایک حسین شاعرانہ تعبیر۔ گونگا لمحہ خود ایک استعارہ ہے۔ بجتی ہوئی پایل کے ساتھ تشبیہ دے کر استعارہ در استعارہ کی کیفیت پیدا کر لی گئی ہے۔

ایک اور شعر ملاحظہ کیجئے:

تمہارے آموں پہ کیا گزرتی ہے جانتا ہوں
لہو ہیں اخروٹ میرے موسموں کی سازشوں سے

یہاں بھی جذباتی تاثر کا بھر پور اظہار ملتا ہے۔ مصرعہ اول میں مبہم استفہام اور مبہم جواب کا خوبصورت امتزاج اس شعر کا حسن ہے۔ ساتھ ہی آم اور اخروٹ جیسے بازاری الفاظ کو شعر کے آغوش میں ایسی استعاراتی شان حاصل ہوگئی ہے کہ یہ معاشرتی ہنگامہ آرائیوں کیلئے علامتیں بن گئے ہیں۔ اسلوب اور لفظیات کی یہ ندرت بعض اوقات حکیم منظور کی شاعری کو غیر مانوس حد تک انوکھا بنا دیتی ہے۔

شاعری احساس و اظہار کا دوسرا نام ہے۔ حکیم منظور کے کلام میں جہاں جذباتی و حسی تاثرات ہیں وہیں شعری ہیت اور ترتیب کی تزئین کاری، فکرِ تازہ کا بھر پور احساس بھی ہے۔ یہی زندہ شاعری کی پہچان ہے۔ حکیم منظور اپنے پورے

کلام میں نہ صرف الفاظ کی ظاہری ترتیب وساخت پر توجہ صرف کرتے ہیں۔ بلکہ معنی آفرینی کے نت نئے گل بوٹے بھی کھلاتے ہیں۔ جو اشعار کو معنوی بلندی عطا کرنے کیلئے ازحد ضروری ہے۔ آئی آر۔ رچرڈ 'شعری ہیت' میں لکھتے ہیں:

'اگر شعری ہیت اور جمالیاتی کیف کیلئے محض الفاظ کی ظاہری ترتیب وساخت پیش نظر رکھی جائے اور اس کی معنوی حیثیت کو اہمیت نہ دی جائے تو اکثر بے معنی و بے ربط بندش بھی شاعری کے معیار پر پوری اتر سکتی ہے۔'[1]

حکیم منظور کے اظہار میں توانائی اور جذبے میں حلاوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جذبوں کو زباں عطا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ شاعری میں الفاظ کے آہنگ اور ترتیب کے ساتھ جذباتی اور حسی تاثر پیدا ہونا لازمی ہے۔ ان دونوں عناصر کے امتزاج سے شاعری کا اعلیٰ معیار قائم کیا جاسکتا ہے۔ آواز یا آہنگ کی اہمیت کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں معنی و ہیت میں خامی ہو وہاں آہنگ و وزن اس کمی کو پورا کردیتے ہیں اور اسی طرح اگر آہنگ میں کمی کا احساس ہوتا ہے تو اسے معنوی بلندی سے دور کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کے گہرے تعاون ہی میں شاعری کی بلندی کا راز پوشیدہ ہے۔

حکیم منظور کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کے کلام میں دونوں کے گہرے تعاون کا بھرپور اظہار ملتا ہے جس کی مثالیں ان کے کلام میں جگہ جگہ دستیاب ہیں۔

قوس قزح اک ایسی جس میں سات نہیں سو منظر ہوں
ایک تمنا سب کے سب تازہ، بہتر سے بہتر ہوں

[1]..... آئی۔ آر۔ رچرڈز۔ شعری ہیت۔ ص ۳۰۷

کون سن سکتا ہے برفوں کے پگھلنے کی صدا
کون کرسکتا ہے سورج کی نوازش کا حساب

حکیم منظور نے جہاں اپنی شاعری کو لفظ و معنی کی خلاقانہ یکجائی، نامانوس لفظیات اور تراکیب بخشی ہیں وہیں انہوں نے غزل کی داخلی اور خارجی ساخت میں بعض توجہ طلب تجربے بھی کئے ہیں۔ انہوں نے متنوع بحروں کا استعمال کیا ہے۔ نادر بحریں جس فنی مہارت سے ان کے ہاں استعمال ہوئی ہیں وہ انہی کا خاصا ہے۔ اس بارے میں قدوس جاوید رقمطراز ہیں:

'حکیم منظور کو ظرف غزل کا گلہ نہیں کہ وہ تو چھوٹی اور بڑی مانوس اور غیر مانوس بلکہ یکسر اجنبی بحروں میں بھی غزلیں کہہ لینے کا سلیقہ اور جرأت رکھتے ہیں'

حکیم منظور کے کلام میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے جو بصارت سے زیادہ بصیرت پر مبنی ہے۔ راج نرائن راز کا ماننا ہے کہ ادھر کسی ایک شاعر کے یہاں ایسا شعری تنوع ایک ساتھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

'نادر الوقوع بحروں میں کہی گئی غزلیں اور ان غزلوں میں الفاظ کا جمالیاتی اور تخلیقی استعمال فنِ شعر پر منظور کی خلاقانہ گرفت کا پتہ دیتے ہیں'[1]

حکیم منظور کے اشعار میں تہہ در تہہ معنی پوشیدہ ہیں۔ اکثر اشعار تک سرسری مطالعہ سے ذہن کی رسائی مشکل سے ہوتی ہے۔ غور کرنے کے بعد ہی شعر سمجھ میں آتے ہیں۔ پروفیسر قاضی غلام محمد نے حکیم منظور کے ایسے کلام کو روغنی رنگوں کی تصاویر سے تعبیر کیا ہے جس کی سطح نزدیک سے کھردری معلوم ہوتی ہے لیکن مناسب فاصلے پر دیکھنے سے سطح صاف اور شفاف نظر آتی ہے۔ حکیم منظور کا کلام بعید از فہم نہیں البتہ قاری

[1]......راج نرائن راز

کوغور وفکر کی دعوت ضرور دیتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

فہم سے بالا نہیں منظور میں
تم نہیں سمجھے تو میرا کیا قصور

بعض اوقات منظور کے ہاں برتے گئے الفاظ چقماق کا کام کرتے ہیں اور معنی کی نئی جہتوں کو روشن کرتے ہیں۔ نئے امکانات کے ساتھ غزل کو برتنے والا یہ شاعر نئی سماعت کے تمام زاویوں پر صرف اور صرف اپنا حق سمجھتا ہے۔

نئی سماعت کے زاوئیے سب، تمہارے منظور سب تمہارے
تمہارا اخروٹ جیسا لہجہ دلوں میں موصول ہوگیا ہے

فکر کی کارفرمائی جدید شاعری کا اہم وصف ہے اور یہ وصف حکیم منظور کی شاعری میں جگہ جگہ اپنی موجودگی کا پتہ دیتا ہے۔ جذبے اور احساس کی پختگی کے ساتھ ہی ساتھ ذہنی بالیدگی حکیم منظور کی شاعری کا اہم عنوان ہے۔

سوچا تو دل کی بات کی ترسیل سہل تھی
دیکھا تو وقت لفظ پہ پیغمبری کا تھا

حکیم منظور کے کلام میں فکر وجذبہ کی ہم آہنگی موثر اظہار کی راہ نکالنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ ان کا شعری احساس کشادہ منظری اور درون خبری سے عبارت ہے۔ مخمور سعیدی لکھتے ہیں:

"حکیم منظور کی آواز عنانیت سے بھرپور ہے ان کی شاعری کا معنوی وزن و وقار جب ان کے مترنم الفاظ کا پیرائیہ اختیار کرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بلند قامت چٹانوں سے کوئی آبشار پھوٹ رہا ہو۔"[1]

[1]......مخمور سعیدی۔ سرورق۔ برف رتوں میں آگ۔ مجموعہ شعر۔ حکیم منظور

حکیم منظور کی شاعری میں طلسماتی تاثر کا شدت سے احساس ملتا ہے۔ آنگنوں میں قاف پریوں کی تمنا لئے زمین پر کسی نئے موسم کے ہنستے بولتے رنگین منظر، ان کی شاعری کو طلسماتی تاثر عطا کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ سماعت اور تکلم کو تازہ اور بہتر خیالات اور لفظ و معنی سے تازگی فراہم ہو سکے۔ شاعر کا ذہن و قلم بنیادی طور پر جدت پسند ہے۔ ان کے اشعار کے معنی و ہیت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حکیم منظور کو جدتیں بھی عطا ہوئی ہیں اور وسعتیں بھی۔ غرض وہ ایک منفرد اور مکمل رنگ و آہنگ رکھتے ہیں۔

شکستگی سے مجھے اک طرح کی الجھن ہے
میرے حدود میں ہر سمت جدتیں لکھنا

جو اب تک نہ لکھا گیا ہو وہ لفظ
نویلی ، نئی ان کہی بات دے

قلم کو دے منظور تازہ خیال
زبان کو نیا حسن دعوات دے

مسکراتے کھیلتے معصوم بچوں کیلئے
آنگنوں میں قاف کی پریوں کے لشکر بھیجنا

حکیم منظور کی شعری دنیا اَن دیکھی اور نئی ہونے کے ساتھ ساتھ مسحور کن بھی ہے۔ تختِ سلیمان، کوہِ قاف اور پریوں کا ذکر ان کے کلام میں طلسمی فضا پیدا کرتا ہے۔ اسی حالت میں شاعر کے متجسس اور فعال ذہن کی عکاسی ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس بات کے گواہ ہیں:

گزری ہے کس کی چاند سواری ادھر سے آج
کیوں ڈل کے ساتھ تختِ سلیماں ہے رقص میں

قاف جیسے کوہ ہیں کتنے یہاں
ان میں رہتی ہی نہیں کوئی پری

اپنے دل میں کردیا تخلیق میں نے کوہ قاف
اس میں سب پریاں اتر آئیں مگر وہ اک پری

حکیم منظور کے ہاں آفتاب ایک ایسی علامت بن گیا ہے جو ان کے کلام میں جگہ جگہ روشنیاں بکھیرتا ہے۔ جہاں ان کے موزوں طبیعت کو ذہنی غذا عطا کرتا ہے۔ وہیں یہی آفتاب ان کے شبنمی وجود کو پل بھر میں نگل جاتا ہے۔ عالم ممکنات میں شاعر پر آفتاب کا نازل ہونا پاکیزگی کی دلیل ہے۔ حکیم منظور کے ہاں ایک نئی اور ان دیکھی لفظوں کی دنیا کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ آفتاب کی روشنی کے ساتھ ہی وحی کا سا عالم طاری ہوتا ہے۔ جہاں شاعر خود نہیں جانتا کہ کون سا نیا لفظ یا نیا خیال اس پر نازل ہو رہا ہے۔

حکیم منظور کے ہاں نکتہ سنجی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ شاعر کو خوابوں کی تعبیر کہنے کا ہنر حاصل ہو چکا ہے۔ کیونکہ ٹوٹے خوابوں پر کتابیں تحریر کرنا اس کا پرانا مشغلہ رہا ہے۔ کسی غیبی طاقت نے زبان کی گرہ کھول کر لفظوں کے خزانوں کا پتہ دیا ہے۔

تم اے منظور اپنے گل قلم کے واسطے اس سے
نئے لفظوں کے پیکر اور معنی کے شرر مانگو

حکیم منظور کو کشمیر اور کشمیر کی زمین سے بے حد لگاؤ ہے۔ خواہ وہ یہاں کا موسم

ہو یا مقامات، پھول ہوں یا پھل، درخت ہوں یا جھیلیں، روزمرہ برتنے والی چیزیں ہوں یا یہاں کی مٹی سے جڑی ہوئی مختلف شخصیتیں یا پھر ساگ زاروں کا ذکر ہو یا کوہساروں کا ان کے دائرہ کلام میں ضرور شامل ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

تازہ دم نمکین چائے اور کانگڑی ہنستی ہوئی
برف گل بو قہقہے، پھر مدعا کیا پوچھنا
اک بند مکاں، گری ہوئی برف سماوار
تاحدِ نظر پوری زمین اک دھنک تھی

برف شبی کے سکوت میں کچے مکانوں کی اداسی شاعر کو مایوس تو کرتی ہے لیکن اگلے ہی پل وہ مایوسی کا چولا اتار کر مستقبل کے خوش رنگ سپنے سجاتے ہیں اور روٹھی ہوئی ہوائیں خوش رنگ پرندوں کے لوٹ آنے کا پیغام سناتی ہیں۔ غرض کشمیر کا ہر رنگ ان کو حسین نظر آتا ہے۔ تبھی تو اس کائنات میں انکو کشمیر کا ثانی نظر نہیں آتا۔

شجر دیودار کا جنگل کے پودوں سے یہ کہتا تھا
مرے کشمیر کا اس پوری دنیا میں نہیں ثانی

حکیم منظور نے جمالیات کو پیکر تراشی عطا کر کے اسے وسیع معنوں میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے یہ موضوع ایسے دلکش اور موثر طور پر بیان کیا ہے کہ سامع کو یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس کا وجود ایک امانت ہے اس کے نزدیک سچا فن زندگی کی خدمت کیلئے ہے۔ حکیم منظور اپنے تخلیقی پیکروں کی تخلیق سے صرف اپنے دل کو ہجومِ جذبات سے ہلکا ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ وہ تمدنی قدروں کو بھی تقویت پہنچانا چاہتے ہیں۔ حکیم منظور بنیادی طور پر حساس طبیعت کا شاعر ہے۔ وہ زندگی کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی محض ایک عارضہ نہیں جسے جیسے جی چاہیے گزار دیا جائے بلکہ اخلاقی ذمہ داریوں کو تقویت پہنچانے کا نام زندگی ہے۔ حکیم منظور کا نام مابعد جدیدیت کے گنے چنے عظیم شاعروں کی فہرست میں

شامل ہے۔ ان سب میں سے بلاشبہ یہ زیادہ پر اثر شاعر ہے۔ کیونکہ حکیم منظور کا پیرائیہ بیان بڑا مشکل ہے۔ خود ہندوستان میں کئی اہم اور معتبر شاعروں نے ان کے طرز و اسلوب کی تقلید کی مگر ناکام ہوئے۔ حکیم منظور نے اپنے اسلوب کے سارے ممکنات کو اپنی بدیع گوئی سے فروغ دیا۔ جسکی اہم خصوصیت بلند آہنگی ہے جو اس دور کے شعراء میں بہت کم نظر آتی ہے۔ چند مثالیں:

شکستہ چہرہ ہو کتنا ہی کیوں نہ وہ منظر
نظر میں ہو تو معانی بتائے گی خوشبو

گرفت سنگ سے ہونے تو دیجئے آزاد
ہر اک سمت تماشا دکھائے گی خوشبو

گلوں نے لکھی ہیں صحرا کے نام خوشبوئیں
ہوا پٹکتی ہے سر، بند ہر دریچہ ہے

حکیم منظور کے مندرجہ بالا اشعار کی مضموں آفرینی میں حکیمانہ حالات کے وزن و وقار کی آمیزش بڑے خوبصورت طریقے سے ہوئی ہے۔ ان کے اسلوب سے اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں کہیں استعاروں اور تمثیلوں کی ندرت ہے اور کہیں مضمون آفرینی اور خیال بندی کی جدت اور سب سے بڑی بات اس میں تخیل سے زیادہ قوتِ بلاغت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

چنانچہ غلام رسول ملک لکھتے ہیں:

'حکیم منظور کی دنیا کے شعر ایک قائم بالذات کائنات ہے جس پر ان کی انفرادیت اور جدت وندرت (Originality) کی گہری اور ان مٹ چھاپ ثبت ہے ان کا منفرد اسلوب لہجہ

اور آہنگ ان کی نادر استعارہ سازی اور پیکر تراشی اور ان کی انوکھی لفظیات ، سب اس ندرتِ فکر ونظر کی توثیق کرتے ہیں ۔[1]

حکیم منظور نے اپنی فنی تخلیق میں اپنے داخلی تجربوں کو ظاہر کیا ہے۔ان کے کلام کے مطالعے سے منکشف ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ زیادہ تر اُس پراسرار لٹریچر پر مبنی ہے جس کا خالق غالب اور میر جیسی شخصیات ہیں۔ تبھی تو ان کے کلام میں کلاسکیت اور جدیدیت کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے ۔ ان کے تمام تر استعارے اور صنائع ان کے اندرونی اور روحانی تجربے کی طلسمی پراسراریت کی غمازی کرتے ہیں۔

حکیم منظور نے اردو زبان کے فنی ورثے سے استفادہ کر کے نئے طرز اور نئی ہیت کی داغ بیل ڈالی۔انہوں نے اندازِ بیان کے نئے سانچے اور نئے استعارے اور مثالی پیکر دریافت کئے اور انہیں نئے ڈھنگ سے برتا۔حکیم منظور کے نزدیک شاعری نہ علوم کی پابند ہے اور نہ لسانیات کی۔اس کے اپنے قوانین ہیں جو اسکی اندرونی منطق پر مبنی ہیں جو تحلیلی منطق سے علاحدہ ہے۔ یہ اندرونی منطق جو استعارے اور صنائع کو جنم دیتی ہے جذبے اور تخیل سے غذا حاصل کرتی ہے۔ماہر لسانیات بھی اس بات پر اتفاق کر چکے ہیں کہ استعارے اور دوسرے صنائع کا جذبے سے گہرا تعلق ہے اسلئے انکی معنی خیزی جزوِ کلام ہے۔حکیم منظور لکھتے ہیں:

منطق ومعروض کام آتے نہیں
بات ہو منظور جب جذبات کی

شعر، شاعر کی اندرونی زندگی کا تجربہ ہے جس میں وجدان وتخیل کو بڑا دخل ہے۔تخیل ہی صنائع کا جنم داتا ہے۔وہ لاشعور کی یادوں کو کھنگال کر صنائع کے حقیقی

[1]......غلام رسول ملک۔سرورق، پھول شفق آنگن۔(حکیم منظور)

جو ہر کو باہر کھینچ لاتا ہے۔ اس کام میں جذبہ اس کا معاون اور شریک کار ہوتا ہے۔ اس تجربے کی روشنی میں حکیم منظور کی شاعری کو پرکھتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

'حکیم منظور کے کلام میں اظہار کی توانائی اور جذبے کی حلاوت نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔'[1]

حکیم منظور کی غزل ایک نموپذیر گل کی طرح ہے۔ جسکے سب اجزاء باہم مربوط اور ہم آہنگ ہیں۔ موضوع چاہے کچھ بھی ہو، فضا کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ ان کے یہاں استعارہ جذبے اور ادراک دونوں پر محیط ہے۔ یہی سبب ہے کہ جہاں انہوں نے بیانیہ انداز اختیار کیا ہے وہاں بھی وہ مبہم طور پر ہمیں کچھ بتلانا اور کچھ چھپانا چاہتے ہیں تا کہ قاری کا تخیل خلاء کو پُر کرے اور احساس اس کے جذبے تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ ایسا کرنے میں لازمی طور پر خود قاری کے ذہن اور جذباتی تناؤ میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے وہ لذت محسوس کرتا ہے۔

حکیم منظور کے کلام میں جذباتی فضا اور کیفیتوں کا پتہ بڑے زور وشور سے چلتا ہے۔ جو ان کی شاعرانہ تخلیق کے وقت ان کی شخصیت پر چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کے استعمال کئے گئے الفاظ کے چہروں پر زندگی کی تابنا کی نظر آتی ہے۔ کبھی ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان کی غزل کا ہر لفظ لفظ نہیں کثنی پیکر ہے۔ کہیں یہ لفظ گاتی ہوئی تصویر بن جاتا ہے۔ تو کہیں رنگین نغمہ۔ حیرت ہوتی ہے کہ سپاٹ لفظوں میں یہ رنگینی کہاں سے آئی ہے۔ اس کا راز حکیم منظور کے لہجے میں ہی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

حکیم منظور کی بلاغت کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ اپنے استعاروں سے تصویر کشی کا کام لیتے ہیں۔ جب وہ ایسا کرتے ہیں تو اس کے مثالی پیکر متحرک تشخص

---

[1] ...... ڈاکٹر جمیل جالبی۔ شعر آسمان (مجموعۂ شعر، حکیم منظور) سرورق

اختیار کر لیتے ہیں۔ کولرج نے تو پیکروں سے خالی شاعری کو راکھ کے ڈھیر سے تعبیر کیا ہے۔ منظور کے ہاں اکثر یہ پیکر کیفیات و محسوسات کے رنگ میں جلوہ افروز ہوتے ہیں اور استعارے ایسی علامات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں کہ انکی تشہیر کرنا ناممکن حد تک مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ بلاغت کا خاص انداز ہے جو ابہام نہیں بلکہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔

حکیم منظور کا کلام بڑا معنی خیز ہے۔ محسوسات کے دروازے ان کے کلام میں کھلے نظر آتے ہیں۔ لہجے اور اسلوب کا جائزہ لینے سے قبل یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ لفظ شعر کی کلید ہے اور حکیم منظور نے دانستہ طور پر اردو شاعری کو ایسے الفاظ دیئے ہیں جن سے اردو غزل نا آشنا نہ سہی لیکن زیادہ دیر محروم ہی رہی ہے۔ اس سلسلے میں مظفر ایرج کا ذاتی تجربہ کچھ اس طرح ہے:

"حکیم منظور کے یہاں ان کے (الفاظ کے) استعمال اور در و بست میں جو ایک خاص شیرازہ بندی ہے اس کا مطالعہ کرتے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ ان کے تخلیقی دربار میں سیاہ فام غلاموں کی طرح سر جھکائے کھڑے اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب کس کو حکمِ باریابی ملے اور منصہ شہود پر نمودار ہو کر حیات و کائنات کے نئے گوشے اجاگر کر سکے![1]

حکیم منظور بنیادی طور پر سنجیدہ شاعر ہے اور سنجیدہ موضوعات کو ہی تراشتے ہیں جن کی وجہ سے ان کے کلام میں فلسفیانہ عنصر غالب نظر آتا ہے۔ چند مثالیں:

نظروں کی حد میں سادہ ورق کی طرح لگوں
سوچے کوئی تو رنگ کا اظہار میں بھی ہوں

---

[1]..... مظفر ایرج۔ تبصرہ۔ سخن برف زاد۔ (مجموعہ شعر، حکیم منظور)

منظور گونگے حرف کو دیتا ہوں میں زباں
مانے کوئی تو ایک ہنر کار میں بھی ہوں

فلسفیانہ رمز نہ جانو، مانو تو بس اتنا ہی
پروالا ہوگا تو پرندہ پتھر ہے جو بے پر ہے

رمزیت اور ابہام کو حکیم منظور نے بڑی خوبی سے اپنے کلام میں سمویا ہے۔ اپنے کلام میں ایک طلسمی دنیا کا اظہار حکیم منظور نے جس رنگینی اور مستی سے کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے کلام کی مستی اور سرشاری رمز وابہام کے جامے میں ملبوس ہے۔ ان کا رمز گہرا اور پر معنی ہے۔ جس سے دقیق رس نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ان کے اشعار کی طلسمی فضا میں ہر باذوق قاری کے ذہن کی جکڑ بندی ہو جاتی ہے۔ ان کے تقریباً تمام مجموعات جمالیاتی نغمہ سرائی سے بھرے پڑے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

نہ مٹنے کی صفت اک ذات میں ہے
جو باقی ہے وہ امکانات میں ہے
خموشی کا مزہ شور تکلم
تجسس کا سکوں خدشات میں ہے

حکیم منظور کے ہاں مانوس تجربوں کے خدوخال نہ صرف بہت ہی ہنرمندی اور بھرپور اعتماد کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں بلکہ ان پرنئی واردات کا گماں گزرتا ہے۔ اور یہ اعتماد امید کے ہمرکاب ہو کر نئے ذائقوں کی تلاش میں سرگرم دکھائی دیتا ہے۔

افق نئے ذائقوں کے ناپید تو نہیں ہیں
رکھا ہے اس آس پر قلم کا مدار میں نے

موجودہ دور کی غزل کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ قاری کے جذبے، احساس

اور فکر کی گہرائیوں کو دور ہی سے چھوتی نظر آتی ہے۔ دیرپا اثرات سے عاری آج کی غزل بس قاری کی ہتھیلیوں کے لمس کو چھوتی ہے لیکن حکیم منظور کے شعری امکانات واضح کرتے ہوئے زبیر رضوی لکھتے ہیں:

"حکیم منظور کی غزل اس اعتبار سے اپنے زمانے میں لکھی اور کہی جانے والی غزل سے مختلف ہے کہ وہ اکہری ساعتوں، کیفیتوں اور جذبوں کی غزل نہیں ہے۔ تھوڑا سوچتے ہوئے اُسے دہراتے ہوئے پڑھیئے تو پھر یہ آپ کے ذہن اور اعصاب پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتی ہے۔"[1]

بحیثیت غزل گو حکیم منظور اپنے شاعرانہ اوصاف سے اپنے ہم عصروں میں قد آور نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا تجزیہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا سب سے بڑا عنصر ان کا خلوص ہے اور یہ خلوص عقلی خلوص بھی ہے اور جذباتی بھی۔ ان کے ہاں جذباتی رنگ حاوی نظر آتا ہے۔ بعض جگہ دونوں کا امتزاج بڑی خوبی سے کیا گیا ہے اور جذبے کی پراسرار کیفیت جگہ جگہ نمایاں ہے۔ منظور کے تغزل میں ایسی کیفیات کا بھرپور احساس ملتا ہے جہاں وہ اپنے ذہن وقلب پر گزری ہوئی واردات کا اظہار کرتے ہیں۔ جو زندگی کے گریزاں لمحات میں النفس وآفاق کی ان کیفیات کو گرفت میں لانے اور الفاظ میں ان کا عکس دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہاں اصولاً ہر عصوبت چاہئے مجھ پر روا
میرا خوں روشن ہے ہاں میں ہی حریفِ شب ہوا

اس قدر یخ بستگی سورج تماشائی تمام
کیا سفیدے کیا صنوبر رنگ سرمائی تمام

---

[1]...... زبیر رضوی۔ سخن برف زاد (شعری مجموعہ۔ حکیم منظور)

کس لئے اخروٹ کے چھلکوں سے رستا ہے لہو

کون رکھتا ہے یہاں اس کی خبر میرے سوا

لفظوں اور پیکروں کو اس لطیف انداز سے برتنے اور خیال انگیز تصویریں پیش کرنا حکیم منظور کا ہی حصہ ہے۔ 'میرا خوں روشن ہے میں ہی حریفِ شب ہوا' کے مصرعے میں حریفِ شب کے خون کا روشن ہونا ایک نہایت ہی نادر، عمدہ اور نشاط انگیز اشارہ ہے۔ اسی طرح 'اس قدر یخ بستگی سورج تماشائی تمام' میں یخ بستگی کی ترکیب ایک مخصوص فضا کی بہت ہی پر معنی تصویر کشی کرتی ہے' اور 'کس لئے اخروٹ کے چھلکوں سے رستا ہے لہو' میں ایک المناک صورتِ حال کی نشاں دہی دلکش انداز سے کی گئی ہے۔

حکیم منظور کے قلبی کیفیات میں اور ذہنی کیفیات میں ایک غیر معمولی گہرائی اور گیرائی ہے۔ ان کی شاعری دنیا و مافیہا کے تمام رنگوں کو سمیٹے ہوئی ہے۔ جہاں ایک طرف قاری اپنی ذات کے عمیق ترین گوشوں تک رسائی پا سکتا ہے وہیں دوسری جانب اپنے خارج میں پھیلی ہوئی کائنات کی وسیع ترین فضا کی سیر بھی کر سکتا ہے۔ یہ شاعرانہ خوبی ہر دور میں کمیاب رہی ہے۔ عبدالمغنی حکیم منظور کے ہاں ایسی ہی کیفیات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'منظور کی غزلوں کا تجزیہ و مطالعہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے گریزاں لمحات میں انفس و آفاق کی ان کیفیات کو گرفت میں لانے اور الفاظ میں ان کا عکس دکھانے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے ذہن و قلب پر گزرتی رہتی ہیں۔ یہ کیفیات منظور کے تغزل کے پیچ و خم میں جا بجا نظر آتی ہیں۔[1]

حکیم منظور کے ہاں قلبی کیفیات سے ذہنی واردات تک کا پورا شعری منظر

[1] ....عبدالمغنی۔ تبصرہ۔ خوشبو کا نام نیا (مجموعہ شعر حکیم منظور)

نامہ متعدد تجربوں پر محیط ہے۔ رفاقتیں، علیحدگیاں، اقدار کی شکست، جدید دور کی تلخ سچائیاں، خود تہمتی، کاروباری ذہنیت کی فتنہ سامانیاں، حاصل اور تردیدِ حاصل اور اس طرح کی دوسری متعدد حقیقتیں اپنی فطری کیفیات اور العباد کے راستے سے ان کے شعری اظہار میں داخل ہوتی ہیں لیکن ان حقیقتوں کے تئیں بیداری کے باوجود حکیم منظور کی شاعری میں ایک طرح کی ضبط کی کیفیت ملتی ہے۔ مسعود منور کہتے ہیں:

'انہوں نے (حکیم منظور) اردو کے رائج اسلوب کو عصری تقاضوں کے پیش نظر بیش رفت کا اشارہ دیا ہے۔ فکری سطح پر اپنے عہد کی لاحاصلی، لایعنیت اور سماجی نا انصافیوں کو انہوں نے نہایت کامیابی سے غزل کا شفاف لہجہ دیا ہے۔' [1]

نئی غزل کے منظر نامہ میں حکیم منظور کا نام ان کے تخلیقی جوہروں کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کے ہاں غزل کی امکانی قوتوں کا سراغ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں کلام میں فکر و جذبہ کی ہم آہنگی موثر اظہار کی راہ نکالنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ بانی لکھتے ہیں:

'ان کا شعری احساس کشادہ منظری اور دروں خبری سے عبارت ہے۔ آج کے دور میں لکھی جانے والی ہم اسلوب غزلوں کے درمیان ان کی غزل تازہ ہوا کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ متجسس اندازِ مشاہدہ، الفاظ کے برتنے کا منفرد زاویہ، ڈکشن کی تازہ کاری یہ سب کچھ ان کے یہاں ایک نیا اسلوب ترتیب دیتا ہوا نظر آتا ہے۔' [2]

حکیم منظور نے اپنی سطح سے شاعری کی زبان کو مختلف پہلوؤں سے گویائی اور معنی خیزی بخشنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ وہ احساس اور اظہار کے درمیان

1..... مسعود منور۔ خوشبو کا نام نیا (مجموعہ شعر۔ حکیم منظور) سرورق

2..... بانی۔ خوشبو کا نام نیا (مجموعہ شعر۔ حکیم منظور) سرورق

کس لئے اخروٹ کے چھلکوں سے رستا ہے لہو

کون رکھتا ہے یہاں اس کی خبر میرے سوا

لفظوں اور پیکروں کو اس لطیف انداز سے برتنے اور خیال انگیز تصویریں پیش کرنا حکیم منظور کا ہی حصہ ہے۔ 'میرا خوں روشن ہے میں ہی حریفِ شب ہوا' کے مصرعے میں حریفِ شب کے خون کا روشن ہونا ایک نہایت ہی نادر، عمدہ اور نشاط انگیز اشارہ ہے۔ اسی طرح 'اس قدر یخ بستگی سورج تماشائی تمام' میں یخ بستگی کی ترکیب ایک مخصوص فضا کی بہت ہی پر معنی تصویر کشی کرتی ہے' اور 'کس لئے اخروٹ کے چھلکوں سے رستا ہے لہو' میں ایک المناک صورتِ حال کی نشاں دہی دلکش انداز سے کی گئی ہے۔

حکیم منظور کے قلبی کیفیات میں اور ذہنی کیفیات میں ایک غیر معمولی گہرائی اور گیرائی ہے۔ ان کی شاعری دنیا و مافیہا کے تمام رنگوں کو سمیٹے ہوئی ہے۔ جہاں ایک طرف قاری اپنی ذات کے عمیق ترین گوشوں تک رسائی پاسکتا ہے وہیں دوسری جانب اپنے خارج میں پھیلی ہوئی کائنات کی وسیع ترین فضا کی سیر بھی کرسکتا ہے۔ یہ شاعرانہ خوبی ہر دور میں کمیاب رہی ہے۔ عبدالمغنی حکیم منظور کے ہاں ایسی ہی کیفیات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'منظور کی غزلوں کا تجزیہ و مطالعہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے گریزاں لمحات میں النفس و آفاق کی ان کیفیات کو گرفت میں لانے اور الفاظ میں ان کا عکس دکھانے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے ذہن و قلب پر گزرتی رہتی ہیں۔ یہ کیفیات منظور کے تغزل کے پیچ و خم میں جا بجا نظر آتی ہیں۔[1]

حکیم منظور کے ہاں قلبی کیفیات سے ذہنی واردات تک کا پورا شعری منظر

[1] عبدالمغنی۔ تبصرہ۔ خوشبو کا نام نیا (مجموعہ شعر حکیم منظور)

نامہ متعدد تجربوں پر محیط ہے۔ رفاقتیں، علیحدگیاں، اقدار کی شکست، جدید دور کی تلخ سچائیاں، خود تہمتی، کاروباری ذہنیت کی فتنہ سامانیاں، حاصل اور تردیدِ حاصل اور اس طرح کی دوسری متعدد حقیقتیں اپنی فطری کیفیات اور العباد کے راستے سے ان کے شعری اظہار میں داخل ہوتی ہیں لیکن ان حقیقتوں کے تئیں بیداری کے باوجود حکیم منظور کی شاعری میں ایک طرح کی ضبط کی کیفیت ملتی ہے۔ مسعود منور کہتے ہیں:

'انہوں نے (حکیم منظور) اردو کے رائج اسلوب کو عصری تقاضوں کے پیش نظر بیش رفت کا اشارہ دیا ہے۔ فکری سطح پر اپنے عہد کی لاحاصلی، لایعنیت اور سماجی نا انصافیوں کو انہوں نے نہایت کامیابی سے غزل کا شفاف لہجہ دیا ہے۔'[1]

نئی غزل کے منظر نامہ میں حکیم منظور کا نام ان کے تخلیقی جوہروں کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کے ہاں غزل کی امکانی قوتوں کا سراغ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے ہاں کلام میں فکر و جذبہ کی ہم آہنگی موثر اظہار کی راہ نکالنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ بانی لکھتے ہیں:

'ان کا شعری احساس کشادہ منظری اور دروں خبری سے عبارت ہے۔ آج کے دور میں لکھی جانے والی ہم اسلوب غزلوں کے درمیان ان کی غزل تازہ ہوا کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ متجسس اندازِ مشاہدہ، الفاظ کے برتنے کا منفرد زاویہ، ڈکشن کی تازہ کاری یہ سب کچھ ان کے یہاں ایک نیا اسلوب ترتیب دیتا ہوا نظر آتا ہے۔'[2]

حکیم منظور نے اپنی سطح سے شاعری کی زبان کو مختلف پہلوؤں سے گویائی اور معنی خیزی بخشنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ وہ احساس اور اظہار کے درمیان

1..... مسعود منور۔ خوشبو کا نام نیا (مجموعہ شعر۔ حکیم منظور) سرورق

2..... بانی۔ خوشبو کا نام نیا (مجموعہ شعر۔ حکیم منظور) سرورق

فاصلے کو کم کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور ادراک و اظہار کی ایسی منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں فکر اور اس کی ترسیل یا خیال اور اس کے اظہاری پیکر دونوں ایک دوسرے میں ضم نظر آتے ہیں۔ حکیم منظور کی شاعری کو بقولِ کولرج ' Poetry of Languages قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ برف رتوں کی آگ اور خوشبو کا نام نیا میں اگر بعض موقعوں پر شعری سفر افکار سے احساس اور احساس سے اظہار کی جانب ہے تو شعر آسماں میں اس سفر کا نقطۂ آغاز خود اسلوب یا اظہاری پیکر بن جاتا ہے جو احساس کے رشتے سے فکر کی جانب قاری کی رہنمائی کرتا ہے۔ فکر کا احساس صبح شفق تلاوت میں شدید تر ہو جاتا ہے اور حکیم منظور کی شعری کائنات اپنے قاری کو سرسری گزرنے کی اجازت نہ دے کر اسے فکری و فنی بالغ نظری اور ذات، زمین اور زمانہ سے ناقابل تنسیخ، جذباتی و احساسی بلکہ ایمانی و ایقانی وابستگی کا بھی تقاضا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ سخن برف زادٗ کے سفر تک قاری کو ذہنی اور فکری آسودگی کے تمام تر سامان میسر آتے ہیں۔ ساتھ ہی شاعر نت نئے تجربات کی بناء پر پھول شفق آنگن کے اور برفآفتاب کی نظموں کے ذریعے پوری طرح قوت اور فکر صلابت کے ساتھ فنِ نظم گوئی پر حاوی نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ حکیم منظور کے کل نو شعری مجموعے (اردو) شائع ہو چکے ہیں۔ 'ناتمام' سے لیکر دقلم : زبان: شگاف' تک کا سفر ایک ان دیکھی، نامانوس اور تازہ شعری دنیا پر محیط ہے۔ اس شعری سفر کے تمام تر تجربات اظہار، لفظ و معنی تراکیب و استعارات، ہیت و موضوع شاعر کی اپنی تخلیق کردہ ہے۔ دقلم :زبان: شگاف' حکیم منظور کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے خصوصاً حکیم منظور کی شخصیت واضح طور پر سامنے آتی ہے اور وہ زندگی کے تمام تر تجربات من و عن قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اس مجموعے میں جہاں موجودہ دور کی حشر سامانیوں کا ذکر ہے وہیں انسان کی اپنی کوتاہیوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ باقی مجموعاتِ شعر کی طرح یہاں بھی کشمیر کا مقامی رنگ غالب نظر آتا ہے۔

سر برہنہ تتلیاں ہیں پھول ہیں دامن دریدہ ڈل ہے ساکت
اس پہ بھی اس شہر کے لوگوں کی آنکھوں میں ذرا بھی نم نہیں ہے

میرے کشمیر میں منظور اب پیدا نہیں ہوتے
نہ میرک شاہ اندرابی نہ آ نور شاہ لولابی

ہم ہیں پورے ذہن آدھی سوچ کے مارے ہوئے
گرچہ پتھر بھی نہ پھینکے پھول بھی بوئے کہاں

حکیم منظور بنیادی طور پر ماہر لسانیات ہیں وہ زبان کے رموز و نکات، زبان کے صحیح استعمال اور اس کی قدر و منزلت سے بخوبی واقف ہیں۔ الفاظ کے گونگے پن کا احساس ان کے تخلیقی محرکات میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ زبان کو وسیلۂ اظہارِ ذات سے زیادہ ایک طاقتور، جمالیاتی ترسیلی نظام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک زبان شاعر کے اپنے وجود کے اقرار، اعتراف اور شناخت و بازیافت کا ذریعہ ہوتی ہے اور جب زبان اپنے پورے فنی لوازمات کے ساتھ برتی جائے تو تخلیق، مزاج اور معیار ہر اعتبار سے منفرد اور نئی ہوتی ہے۔ اس دشوار گزار عمل میں اکثر شعراء لڑکھڑا جاتے ہیں لیکن حکیم منظور کامیابی کے ساتھ ایسے منازل طے کر جاتے ہیں۔ قدوس جاوید زبان کے بہتر امکانات کی توسیع کیلئے کئی جزیات کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

'شاعر کو زبان کی روایت، الفاظ کی قوت، سماعت کے زاویوں، فکر و خیال کی اہمیت، کیفیات کی ہمہ گیری اور اظہار کا سلیقہ وغیرہ بہت ساری باتوں کا نہ صرف خیال رکھنا پڑتا ہے بلکہ انہیں کچھ اس طور پر برتنا پڑتا ہے کہ اس کی شاعری کی زبان، زبان کے

امکانات کی توسیع کا سبب بھی ہے اور خود اسکے وجود اور اسکی تخلیق کو زندہ اور متحرک رکھنے کا ذریعہ بھی۔ ظاہر ہے یہ چیز پختہ تخلیقی شعور، منفرد دانشوری، دیدہ وری اور جرات مندی کی متقاضی ہے اور حکیم منظور نے عرصہ ہوا، اپنے دوسرے تیسرے مجموعے سے ہی یہ ثابت کردیا تھا کہ ان کے اندر یہ ساری صفات اپنی عمدہ ترین صورتوں میں موجود ہیں۔"

حکیم منظور کا تمام تر کلام قارئین سے قلب وذہن کی بیداری اور بھرپور واقفیت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس پورے شعری سفرنامے میں قاری کو ہر کام پر قلب ونظر کی صفائی اور فکر وخبر کی وسعت کے ثبوت فراہم کرنے پڑتے ہیں۔ تب کہیں جاکر اسے انسانی جبلتوں اور قوتوں کیلئے سکون وراحت کا سامان میسر آتا ہے۔

قدوس جاوید 'صبح شفق، تلاوت' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'یہ (صبح، شفق، تلاوت) ساتواں در، فنی وفکری اعتبار سے جتنا وسیع وعریض اور بلند بالا ہے اتنا ہی دشوار گزار بھی۔ غزل غزل، شعر شعر، فکر واحساس، تجربہ ومشاہدہ، زبان واظہار کی تازگی اور ندرت شرط عائد کرتی ہے کہ اس در سے وہی گزر سکتا ہے جسکے قلب ونظر کی صفائی مسلم، فکر وخبر کی وسعت، مصدق اور فنی اقتفا دوقدر کی واقفیت معتبر ہو۔' [۲]

حکیم منظور بیدار ذہن رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں فنی پختگی اور تخلیقی شعور کی بالیدگی کا بھرپور احساس ملتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کی زبان کو گویائی اور لفظوں کو معنی خیزی عطا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے کلام میں تنوع ہے۔ جہاں تکلم میں جدت ہے وہیں اظہار میں نئی ادا بھی۔ ساتھ ہی جو الفاظ، پیکر، علامتیں اور استعارے وہ اپنے کلام میں برتتے ہیں وہ قاری کو ضرور کہیں کہیں اجنبی سے محسوس ہوتے ہیں کیونکہ اس نوع کے شعری زبان

کے استعمال سے اب تک اردو شاعری محروم ہی رہی ہے۔

راج نرائن راز اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"منظور کے یہاں جداگانہ فکری سطح پر الفاظ کے تخلیقی استعمال کی ایک علامت تجریدی تمثیل ہے۔ جو بیک وقت اس کے اندازِ مشاہدہ اور اسلوب کا حصہ ہے۔ تجریدی تمثیل کا یہ انداز ممکن ہے قاری کو اجنبی، کہیں نامانوس اور گاہے کھردرا معلوم ہو۔ تاہم یہ اپنے اندر بے پناہ امکانات رکھتا ہے"[1]

اس سلسلے میں غلام رسول ملک کی رائے یوں ہے:

"حکیم منظور کی شاعری کے متعلق اگر کوئی شکایت پیدا ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ غیر مانوس حد تک نادر اور انوکھی ہے۔ یہی اس کی قوت کا اصل منبع بھی ہے"[2]

حکیم منظور کو اپنی شعری زبان و بیان پر بھرپور اعتماد ہے اور یہ اعتماد انکو اپنے قارئین کے وسیع حلقے کے تعاون سے ہی حاصل ہو پایا ہے۔ چند اشعار ان کے اس اعتماد سازی کی نشاندہی کرتے ہیں:

ہو کوئی سماعت میری پہچان ہے اپنی
منظور کہ اک 'شعر گھرانا ہے' میرا بھی

منظور گونگے حرف کو دیتا ہوں میں زبان
مانے کوئی تو ایک ہنر کار میں بھی ہوں

۱.....راج نرائن راز۔ خوشبو کا نام نیا۔ سرورق

۲.....غلام رسول ملک۔ پھول شفق آنگن کے۔ سرورق

میں حرف تازہ مجھ کو سمجھنے کے واسطے
منظور، فہم، آگہی ،عرفان چاہیئے

جواب منظور کوئی کیا دے، نئے تکلم کی رزم گہہ ہے
یہاں کوئی بے ادانہ آئے، یہاں کوئی بے زبان نہ آئے

حکیم منظور کا اکثر کلام مشکل ترین لسانی پیکروں میں مزین نظر آتا ہے۔
مثال کے طور پر

دھوپ جواں جب ہو جائے گی
سایوں کا محور بدلے گا

پھول نظروں میں فقط اک ہی سوال
تتلیاں کیوں اس قدر تہہ دار ہیں

زمین جب تک نہ اپنا حصہ ادا کرے گی
گلاب کھلتے نہیں ہوا کی سفارشوں سے

مجید مضمر حکیم صاحب کی شاعری کے بارے میں ایک جگہ کچھ یوں لکھتے ہیں:
'مجھے حکیم منظور کے متعدد اشعار سخت اخروٹ معلوم ہوتے ہیں جسے کشمیر میں 'وونٹ ڈون' کہتے ہیں۔ اس کا مغز نسبتاً زیادہ سخت چھلکے میں اس طرح چھپا ہوتا ہے کہ اسے نکالنے میں بڑی محنت لگتی ہے۔ جبھی تو بہت زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ حکیم منظور کی شاعری کا ست بھی کہیں کہیں سخت ترین لسانی اور ہیتی چھلکے میں چھپا ہوا ہے۔ اس ست کو نکالنے میں اشتیاق، محنت اور تلاش کا عمل بجائے خود ایک

جمالیاتی عمل ہے۔[1]

حکیم کا کلام فکری سطح پر الفاظ کے تخلیقی استعمال کی بہترین علامتیں ہیں۔ یہ علامتیں مشاہدے اور آہنگ کا ایک اہم جز ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ علامتوں کا تخلیقی استعمال کسی حد تک کھردرے پن کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اور قاری کو چند لمحوں کیلئے اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے لیکن حقیقت میں اسی کھردرے پن کے اندر ایک تخلیقی شان پوشیدہ ہے۔ شاعر کا تمام تر تخلیقی عمل انتہائی تہہ دار ہے۔ معنوی تہہ داری گہرائی اور گیرائی انتہائی معنی خیز ہے جسے قاری کے احساس کو مہمیز ملتی ہے۔

حکیم منظور کی غزلوں کی خاص بات ان کا فکری اور تعقلی عنصر ہے۔ فکری اور تعقلی عنصر ہمیشہ شعریت کے عمل کو کم کر دیتا ہے اور شعریت اپنا اثر کھو دیتی ہے لیکن منظور نے کسی نہ کسی حد تک شعریت کے عمل کو زنگ آلود ہونے سے بچالیا ہے۔ حالانکہ فکر و فلسفہ صرف علامہ اقبال کے اپنی بے پناہ شعریت کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ دیگر شعراء اس عمل سے گزرتے وقت کہیں نہ کہیں ضرور ٹھوکر کھاجاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فکری رویہ منظور کے ہاں کہیں کہیں خشک فلسفہ بن کر رہ جاتا ہے۔ تاہم اعتدال کا عنصر بھی قائم رہتا ہے۔

غزل کا مزاج شعریت کا مزاج ہے۔ یہ فکری رویہ فلسفے کو پوری طرح برداشت نہیں کرتا۔ جب تک کہ اس میں شعریت کا عمل سامنے نہ آئے۔ اردو شاعری میں غالب کا فکری عنصر اور تعقلی عمل شعریت کا حامل رہا ہے۔ غالب کی فکر اور بلند پروازی اعلیٰ پایہ کی ہے اور استفہامیہ اندازِ فکر بھی پایا جاتا ہے۔ حکیم منظور کے ہاں بھی استفہامیہ انداز فکر بدرجہ اتم موجود ہے۔ استفہام اور استعجاب ان کے ہاں ایک باقاعدہ عمل بن کر سامنے آتا ہے۔ یہ دراصل شاعر کے ذہن کی حسیاتی کیفیت کی غمازی بھی کرتا ہے۔ چند اشعار

[1]...... مجید مضمر۔ رنگ باتیں کریں۔ ص ۱۰۲

ترا گھر زد پہ آیا تو ابابیلوں کے لشکر تھے
میرا گھر زد پہ ہے اب تو ہے چپ، یہ کیا خداوند

مجھ سے یہ کہہ سکا نہ گئی رات کا سکوت
خوشبو تمام ہو کے ہوا کیوں اداس تھی
میں نے پوچھا بھی ہوا پیڑوں کی دشمن کیوں بنی
وہ یہ کہتا ہے کہ میں بس چپ رہوں دیکھا کروں

حکیم منظور نے ایسا مکالماتی انداز متعارف کیا جس میں استفسار اور جواب دونوں ایک مصرعے یا ایک شعر میں اس طرح سما جاتے ہیں کہ اس کے اختصار پر تفصیل رشک کرتی ہے۔ ہم صوت الفاظ کا مصرعوں کے شروع میں ہی استعمال کرنا ان کا ایک اہم تجربہ رہا۔ مثال کے طور پر:

سوال: خوشبو ہوا کی کیسی؟ جواب: شب زندہ دار ہو گیا؟
سوال: پیکر شفق کا کیسا؟ جواب: عکس خیال کیا ہے؟

حکیم منظور کے اشعار کے اجزائے ترکیبی یہی استفسارانہ اور استفہامیہ لب ولہجہ ہیں۔ سوال، سوال کے جواب میں ایک یا متعدد سوال، یا پھر سوال کا استفہام، گاہے جواب، گاہے استعجاب اس اندازِ بیان سے منظور کے اشعار کی شدت اور تاثیر دونوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے اشعار قاری کے ذہن میں ارتعاش دل میں خلش اور احساس میں ایک کھٹک چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسی غزلوں کے بارے میں راج نرائن لکھتے ہیں؛

''ایسی غزلوں میں منظور کی جودتِ طبع اور شعری صلاحیتوں کے جوہر خصوصیت سے بروئے کار آئے ہیں۔ فعلیہ احساس، استفہامیہ مزاج اور اسکے نتیجے میں پیدا استعجاب اور اعتدال سے

منظور کے اشعار کا آہنگ تازہ، رنگ نیا اور ڈھنگ دلکش بنا ہے۔"[1]

اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

منظر کھلا تھا کیسا دریچے کی پشت پر
آوارہ رنگ رنگ نگاہِ قیاس تھی

تری طرح کوئی عکسِ خیال ہوں میں بھی
ہوا جواب دے میرا! سوال ہوں میں بھی

شاعر کے ہاں ایسے اشعار میں فکر کا عنصر غالب نظر آتا ہے کیونکہ شعر کی داخلی اور خارجی ساخت میں اتنی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے کہ شعر کو موسیقی کے سحر سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے اور یہ سماعت کے بجائے قرأت اور بصارت سے وابستگی اختیار کر جاتا ہے۔ ایسے موقع پر شاعر کی ذہانت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

پروفیسر غلام رسول ملک 'شعر آسماں' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

'حکیم منظور کی شاعری کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ جذبہ و احساس کی ایک زیریں رو اور ایک متجسس اور فعال ذہانت اس کا تانا بانا فراہم کرتے ہیں اور دونوں عناصر ان کی نادر شخصیت اور مخصوص انفرادی فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں۔'[2]

منظور کی شاعری زندہ شاعری ہے۔ زندہ شاعری کی پہچان یہی حسیاتی کیفیت ہے جو شاعر کو مناظرِ فطرت اور ماحول کی بے اعتدالیوں پر شک کی نگاہ ڈالنے پر مجبور کرتی ہے۔ شمیم حنفی ایک جگہ لکھتے ہیں:

[1]......راج نرائن راز۔ دیباچہ۔ (ناتمام۔ حکیم منظور) ص۔۱۶

[1]......غلام رسول ملک۔ دیباچہ۔ شعر آسمان۔ حکیم منظور

'انکی شاعری میں اپنے گردوپیش کے طبعی ماحول اور مظاہر کی رونمائی ہے۔اس شاعری کے واسطے سے حکیم منظور کا عہد بھی پہچانا جاتا ہے اور وہ تہذیبی معاشرتی اور ارضی کائنات بھی جس میں حکیم منظور کا شعور سانس لیتا ہے'[1]

شمیم حنفی حکیم منظور کی شاعری کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

'حکیم منظور کی غزل کا محاورہ اور ڈکشن نامانوس ہے۔اس میں کرافٹ کی آنچ زیادہ ہے۔'[2]

یہ حقیقت ہے کہ زبان تخلیقی وفور اور اظہار پر شاعر کی گرفت مضبوط نہ ہوتو زبان کے حوالے سے شاعری میں جدت اور نئے امکانات پیدا کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوگی ۔ دراصل شعر کی زبان یا الفاظ اس کی ہیت کا سب سے جاندار حصہ ہوتے ہیں، کیونکہ الفاظ کا ردعمل سننے والے کے جذبات، احساس اور تخیل پر ہوتا ہے جبکہ دوسرے عناصر کا فوری اثر قوت سامعہ پر۔ چنانچہ اردو شاعری کی تاریخ میں ایک ایک موزوں ومناسب لفظ کی تلاش میں شعراء کے رت جگوں کی جو داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ وہ یوں ہی بے معنی نہیں خود حکیم منظور 'صبح شفق تلاوت' میں اس حقیقت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

لہو جلا کتنا لفظ گو کا، یہ کس نے سوچا، یہ کس نے جانا
ہیں لوگ منظور خوش اسی پر کہ لفظ پہنچا عبارتوں تک

'قلم زبان شگاف' سے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں:

لفظ ہی ہوں گے اگر کم کوش اے منظور پھر
سوچئے شعروں میں گرمی سی کہاں سے آئے گی

1۔۔۔۔۔شمیم حنفی۔ برف رتوں میں آگ۔ سرورق
2۔۔۔۔۔شمیم حنفی۔ برف رتوں کی آگ۔ سرورق

جو نیا لفظ ہے تحریر کی سرحد سے پرے
میں نے اس لفظ کا اظہار تراشا ہے ضرور

حکیم منظور شاعری کی مروجہ زبان، محاورہ کو توڑ کر ذات، زمین اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ایک نئی زبان کی تشکیل کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کیونکہ موجودہ دور کی حشر سامانیوں کی وجہ سے تخلیقی ذہن پر اسکے معاشرتی ذہن کا دباؤ ہے اور اس دباؤ کے پیشِ نظر حکیم منظور نے جہاں اپنے بعید ترین ماضی کو تمام تر تہذیبی وثقافتی انسلاکات کے ساتھ اپنے لاشعور میں زندہ کر دیا ہے وہیں دوسری طرف حال کے حوالے سے آنے والے کل کا شعور بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ 'صبح شفق تلاوت' کی غزلوں میں اس پورے رویئے کی مختلف جہتیں نظر آتی ہیں۔ چند مثالیں

یہ مرے زمانے کا ایک عجیب صدمہ ہے
شیشہ تن ہوئی مٹی پھول کیا کھلائے گی

چند قصے کہ ہیں آوارۂ تحریر ابھی
ان کو لکھنا ہے مجھے بحر نہ بر لکھنے ہیں

میں کیا یہ زمین کیا میری محنت کا صلہ کیا
جب روح میں گل کے ہی نہ کھلنے کی کسک ہو

کتنے رنگوں کے دامن، ہاتھوں سے چھوٹے سوچوں
آئینوں کے ڈر سے ٹوٹے کیا کیا سپنے سوچوں

ہم اجنبی کی طرح نئی نسل کیلئے
ہم وہ کہ جن کو اب بھی تعلق گھروں سے ہے

ایسے کئی اشعار بطور مثال پیش کئے جاسکتے ہیں۔قدوس جاوید لکھتے ہیں:

'راست بیانی حکیم منظور کا شیوہ نہیں کہ یہ بات غزل کے مزاج کے منافی بھی ہے ہاں اگر حکیم منظور کے استعاروں کے تہہ دار سمندروں کی گہرائی تک رسائی ممکن ہو تو اس نوع کے اشعار ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے بہت کچھ کہتے نظر آئیں گے۔'

حکیم منظور روایتی لفظ و معنی کے حوالے سے اپنی بے اطمینانی ظاہر کرتے ہیں۔ وہ غیر رسمی افکار وخیالات کو منفرد اسلوب میں اظہار کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کو ظرفِ غزل کا گلہ نہیں۔ وہ تو چھوٹی بڑی، مانوس اور غیر مانوس بلکہ کہیں کہیں یکسر اجنبی بحروں میں بھی غزلیں کہہ لینے کا سلیقہ اور جرأت رکھتے ہیں۔شاعری کی مروجہ زبان کی بے بضاعتی سے ہی انہیں شکایت ہے۔

خامشی ، دھوپ، کسی بات کا معنی نہ مزاج
سوچئے ، سایۂ اظہار کہاں سے آئیں

رخ بہ رخ صرف عبارت ہے تکلف کا غبار
اب یہاں آئینہ بردار کہاں سے آئیں

وہ جس سے لفظ سلامت نہ گفتگو مربوط
فرازِ خط میں وہ حرفِ نشیب رکھا کیوں

میں نے پوچھا تھا کہ رشتہ ہے میرا کیا مجھ سے
لفظ کے لفظ تھے موجود مگر کیا لکھتا

بے تپش رنگ سے تصویر بناتا کیسے
بے نمک مٹی پہ خوشبوئے بیز کیا لکھتا

حکیم منظور کے ایسے ہی رنگ میں لکھے گئے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اردو کی عصری شاعری کا جمالیاتی کردار کھوکھلا ہو چکا ہے اور معنی آفرینی کی نئی جہتیں مفقود ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس سلسلے میں قدوس جاوید جدید شعراء کے ساتھ ساتھ بعد کے شعراء کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اردو کی عصری شعری زبان، تشبیہات واستعارات علائم اور پیکر کے نت نئے استعمال کے باوجود امکانات سے پُر تخلیقی زبان کے بجائے، شعبدہ بازی لگتی ہے۔ عصری اردو شاعری کی زبان بہ استثنائے چند تہذیبی وثقافتی جڑوں سے اکھڑ کر اپنا جمالیاتی کردار کھوتی جارہی ہے۔ قلب کو گرمانے اور روح کو تڑپانے کی صلاحیت، کچھ ترقی پسندوں اور کچھ جدیدیوں نے پہلے ہی چھین لی تھی۔ بعد کے شاعروں نے بھی شاعری کی زبان کو کچھ اس طرح برتا ہے کہ اب یہ عام سے جذبات کو مس کرنے اور ذہن وشعور کو معنی آفرینی کی نئی دنیاؤں سے روشناس کروانے کا ہنر بھی بھول چکی ہے۔'

زبان کے تئیں حکیم منظور کا تجرباتی رویہ ان کے شاعرانہ وجود اور ان کی غزلوں کے فنی کردار کی شناخت کی بنیاد ہے۔ وہ کبھی بھی اپنی فکر یا زبان پر تخلیقی اور وجدانی کیفیتوں کو حاوی ہونے کا موقعہ نہیں دیتے۔ حکیم منظور پر ترکیب ساز اور

اصطلاح گرہونے کے الزامات ہیں لیکن یہ عمل منظور کے بے پناہ تخلیقی امکانات کی نفی کے مترادف ہے۔قدوس جاوید مزید لکھتے ہیں:

'حکیم منظور اپنی شاعری میں زبان کے نئے زاویے تراش کر معنی خیزی کے نئے جہاں ضرور آباد کرتے ہیں۔ لیکن اسکا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ حکیم منظور اپنی فکر یا زبان اپنی خالص تخلیقی اور وجدانی کیفیتوں پر حاوی ہونے دیتے ہیں ۔ فکر وخیال کی ہر ندرت اور زباں کے استعمال کی ہر جدت بہر حال حکیم منظور کے بے پناہ تخلیقی وفور کے تابع رہتی ہے۔'

نئے زاویوں سے تراکیب، اصطلاحات اور پیکروں کا استعمال حکیم منظور کی شاعری کو نئی جہت عطا کرتے ہیں۔ حکیم منظور بنیادی طور پر اپنی مٹی سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ وہ واقعات کو جس طرح محسوس کرتے ہیں، من وعن ویسے ہی پیش نہیں کرتے بلکہ اپنے تجرباتی تخلیقی رویوں کو روبہ عمل لاکر سادہ خیال کو بھی خوبصورت پیرائیہ میں پروکر پُرکار بنادیتے ہیں۔ مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

"حکیم منظور نے اپنے گردوپیش سے جو کچھ اخذ کیا ہے اسے خوبصورت پیرائے میں پیش کردیا ہے اور اس طرح کہ جو بات بھی کہی ہے روشِ عام سے ہٹ کر کہی ہے اور جو لفظ بھی استعمال کیا ہے اسے نئی معنویت عطا کردی ہے۔ مختصراً اس کی غزل سے ایک منفرد اور نئی جہت سامنے آئی ہے۔"[1]

چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

جسے نئے کی تلاش، پڑھ لے وہ، میری آنکھوں کی دو کتابیں
کہ ان میں نادیدہ وادیوں کے، تمام دفتر لکھے ہوئے ہیں

---

[1]...... مشفق خواجہ۔ صبح شفق: تلاوت (شعری مجموعہ۔ حکیم منظور) سرورق

فصل سایوں کی، کبھی دھوپ نہ اگنے دے گی
جبر: خود اپنی نگاہوں میں شجر لکھتے ہیں

سنگ شعلوں سے اگانے ہیں مجھے تازہ گلاب
نقش سارے ہی بہ اندازِ دگر لکھنے ہیں

حکیم منظور کے شعری خزانے میں اب تک ایسے کئی شعری تجربات شامل ہو چکے ہیں جو نہ صرف اچھوتے اور ان چھوئے ہیں بلکہ نادر اور لامثال بھی ہیں۔ وہ شاعری میں بالکل جداگانہ رنگ رکھتے ہیں۔ عام روزمرہ استعمال میں لائے جانے والے الفاظ کو وہ شاعرانہ پیکر میں ڈھال کر عارفانہ رنگ عطا کرتے ہیں۔ گونگی خوشبو، کچے کھلونے، مسکراتی برف، روتی دھوپ، بادامی بدن، برف تن، دھوپ دیوتا جیسے انسلاکات کا استعمال ان کی شاعری کو اچھوتا رنگ عطا کرتا ہے۔ موسم، پیڑ، سمندر، صحرا، پھول، پھل اور جھیلوں کے ذکر سے ان کی شاعری میں ماحولیات کا عنصر ابھرتا ہے۔ شاعر حنا اور اخروٹ کا رشتہ وضع کر کے رنگوں میں پوشیدہ رشتوں کی نزاکتوں کو بڑی خوبصورتی سے ظاہر کرتا ہے۔ کشمیریت کے نقش جس نفاست کے ساتھ حکیم منظور کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ اسکی مثال بہ مشکل کہیں اور ملتی ہے۔

راج نرائن راز لکھتے ہیں:

> ”حکیم منظور ایک صاحبِ اسلوب شاعر ہیں۔ ان کے فکر و احساس کا سرچشمہ ان کی دھرتی کی اعلیٰ تمدنی، تہذیبی اور علمی روایات ہیں۔ انہوں نے کشمیر اور کشمیریت کے نقش کو کمال سادگی سے علامتوں کے طور پر استعمال کیا اور انہیں مقامی سے آفاقی بنا دیا ہے۔ یہی عمل ان کی منفرد شاعری کی پہچان ہے۔“[1]

[1]...... راج نرائن راز۔ صبح شفق تلاوت۔ پیش لفظ ص۔ ۱۰

جاندار انفرادیت اور ندرت فکر ونظر نہ صرف ماحول اور روایت سے گہری وابستگی کا ہی نتیجہ ہوسکتا ہے۔ بلکہ شاعری میں نت نئے تجربات کی ترسیل مکمل ممکنات میں شامل ہے۔ جسکا بھرپور احساس حکیم منظور کی تمام شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ غلام رسول ملک لکھتے ہیں:

'ایک اچھے تخلیقی فن کار کی طرح وہ ماحول اور روایت سے بیک وقت وابستہ بھی ہیں اور جدا بھی وابستہ اسلیئے کہ اس وابستگی کے بغیر تخلیقی فن کار کی مثال اس درخت کی سی ہوتی ہے جس کی جڑیں کاٹ دی گئی ہوں اور جدا اس لئے کہ جڑوں کے واسطے سے وہ ماحول اور روایت کی زمین سے جو مواد اخذ کرتے ہیں اسے تخلیقی عمل کے ذریعے تحلیل کر کے اپنے نادر سانچوں میں ڈھال لیتے ہیں'[1]

حکیم منظور کے ہاں مقامی دریاؤں، جھیلوں اور جگہوں کے علاوہ پھلوں، موسموں اور شخصیات کا ذکر ان کی اپنی زمین سے جڑے ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ گلاب، جہلم، ولر، ڈل، اہرہ بل، مانسبل، سیب، اخروٹ، بادام، برف باری، کانگڑی، پھرن جیسے کئی الفاظ افراط سے ملتے ہیں۔ میرک شاہ اندرابی، آنور شاہ لولابی، حسن کوزہ گر جیسی مقامی شخصیات کا ذکر اس بات کا ثبوت ہے کہ اپنی شاعری کے ذریعے پرانی روایات کو زندہ رکھنے میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ دراصل ایک سچا شاعر، اپنی مٹی سے الگ سوچ ہی نہیں سکتا جس سے اسکا خمیر اٹھایا جاچکا ہو۔ حکیم منظور کے ایک عزیز اور ان کے ہم عصر منظر ایرج لکھتے ہیں:

'جس شخص (حکیم منظور) کی تخلیقی جڑیں اپنی زمین میں دور تک پیوست ہوتی ہیں۔ جن سے وہ اپنی روایات، احساسات وجذبات، تہذیب وتمدن، ثقافت معاشرت کی آبیاری بھی کرتا ہے

1.....غلام رسول ملک۔ پھول، شفق، آنگن کے، سرورق

اورنشو ونما بھی۔ جس سے اس کا خمیر اٹھایا جا چکا ہوتا ہے۔ کیسے اپنے
آپ کو ان خصوصیات سے الگ کر سکتا ہے جو اس کے ارد گرد اس
کے اپنے لہو کی خوشبو سے مہک رہے ہوتے ہیں۔[1]

حکیم منظور کے یہاں افکار وخیال اپنے اظہار کیلئے نئی صورتیں بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں مختلف ہیئتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ بحور اور قافیوں کے ساتھ ساتھ منظر اور موضوع بھی بدلتے ہیں۔ حکیم منظور الفاظ وافکار پر لگام کسنا بھی جانتے ہیں اور ضابطوں اور قاعدوں کی زنجیروں میں اپنی تخلیقات کو پابند نہ کرنے کے باوجود شاعری کے اصل وصف کو قائم رکھنے کا ہنر بھی بخوبی جانتے ہیں۔

نہ مانے منظور کوئی، کیا غم ہے میرا احساس میرا اپنا
میں اَن چھوئے تازہ معنیوں کی ثمر شگفتہ زبان ایسا

حکیم منظور گہرے مذہبی شعور کے مالک ہیں۔ ان کے ساتھ گفتگو کرنے پر اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کا دل عشق محمدیؐ کے نور سے روشن اور منور ہے۔ ذکر محمدیؐ کے ساتھ ہی ان کی آنکھیں چھلکنے لگتی ہیں اور کسی حدیث مبارک کے بیان کرنے پر تو وہ معصوم بچے کی مانند رو بھی پڑتے ہیں۔ ندامت کے آنسوؤں کو ہی وہ نجات کی راہ تصور کرتے ہیں اور حضورؐ کی سفارش اور بخشش کیلئے وہ مصروفِ دعا رہتے ہیں۔ مگر دوسرے شاعروں کی طرح وہ عشق محمدیؐ میں خدائے برتر کو بھولتے نہیں بلکہ خدا تک پہنچنے کیلئے عشق نبیؐ کا راستہ سہل اور آساں سمجھتے ہیں۔ وہ بڑے ہی انہماک کے ساتھ ایسے پاکیزہ اور اچھوتے خیالات پیش کرتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار پڑھ کر ہوتا ہے:

میں تفسیر کی سطح پہ ہوتا بھی کیا
برہنہ تھا سو حجابوں میں تھا

[1]...... مظفر ایرج۔ تبصرہ۔ سخن برف زاد۔ (شعری مجموعہ۔ حکیم منظور)

میں جن سے سرشار ہو گیا ہوں وہ سارے لمحات بے تلاوت
کہاں لکھوں ان کو گرد میرے، مہیب پتھر لکھے ہوئے ہیں

میر امقصد صرف تیری ذات کی خوشنودیاں
مجھ کو اس سے کیا غرض آسماں نو ہیں کہ سات

وہ میرے باب میں منظو رکرم ہے سارا
کچھ اثاثہ نہیں ، جز دامنِ نم میرے پاس

حکیم منظور جدید دور کی تلخ سچائیوں کا ہنس کر مقابلہ کرتے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ ایمان اور خوش عقیدگی کا دامن تھامے ہوئے ہوتے ہیں اور ایسے کرشمے کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں جب وہ اس چہرہ ساز (خدا) کا دیدار کرے۔

چہرہ سازی میں نہیں جسکا مدمقابل منظور
ایسا کچھ ہو میں کبھی اس کا بھی چہرا دیکھوں

کاش اس اصل سے واقف میں کبھی ہو جاتا
کاش سجدوں سے پرے ہوتیں نمازیں میری
وہ چہرہ نگاری میں ماہر ہے اُسے غم کیا
اُس کیلیئے بے معنی آئینہ گری میری

زندگی کی بے ثباتی کا تصور منظور کی شاعری میں بہت واضح طور پر جھلکتا ہے۔ دنیا انکو بولتے کھلونوں کا ایک کارخانہ جیسا لگتا ہے۔ کل کائنات کی حقیقت پتہ کرنے کیلیئے وہ خوشبو، پھول اور رنگوں سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ راز ان پر منکشف ہو چکا ہے کہ کل کائنات میری ہوتے ہوئے بھی میری نہیں۔ یہ زندگی تو

فقط نگاہوں کا دھواں ہے۔ یہاں صرف اللہ کی ذات ہی غیر فانی ہے۔ شاعر بقیہ زندگی کو ہوس قرار دیتا ہے۔ مجموعہ 'خوشبو کا نام نیا' کی ایک غزل کا ردیف 'اللہ بس باقی ہوس' ہے۔ یہ ردیف بہت ہی خوبصورت اور اپنے آپ میں معنی کا سمندر لئے ہوئے ہے۔

منظر مرے، میرے اُفق، میری نظر، میری خبر
پھر بھی مرا اِک ہی بیان، اللہ بس باقی ہوس

رنگوں سے آلودہ نظر شیشے کے رستوں کا سفر
ہر اِک قدم اِک امتحان اللہ بس باقی ہوس

قلبی کیفیات سے ذہنی واردات تک ان کا سارا شعری منظر نامہ کئی کامیاب تجربوں پر محیط ہے۔ ان کی شاعری کی شیرازہ بندی جس نظم وضبط کے ساتھ ہوئی ہے اس کے پسِ پردہ کوئی قوت ہے۔ یہ وہی طاقت ہے جو موجودہ دور کے حشر سامانیوں کے باوجود شاعر کا وجود بکھرنے سے روکے ہوئی ہے۔

حکیم منظور کو وہبی شاعر قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ تمام شاعرانہ پس منظر میں وہ وحدت الوجود کے قریب تر دکھائی دیتے ہیں۔ قربتوں کے انہی لمحوں میں فکر ونظر کے کئی کئی منقش بستیاں آباد ہوتی ہیں جہاں خیال وافکار پیکری صورت اختیار کر کے شعروں میں ڈھل جاتے ہیں۔ ایسے کئی اشعار بطورِ مثال پیش کئے جا سکتے ہیں جن کو الہام کا درجہ حاصل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو پُر آشوب دور کی تباہ کاریوں کا کئی دہائیوں قبل ہی علم وعرفان حاصل ہو چکا تھا۔

آگ وہ باہر ہے پہنچے گی اندر بھی
سائے جل جائیں گے اور پھر پیکر بھی

مخمور سعیدی لکھتے ہیں:

دحکیم منظور وہی شاعر ہیں۔ان کی آواز ابتداہی سے اس کیفیت کی
حامل رہی جو لفظ و معنی کی خلاقانہ یکجائی سے وجود میں آتی ہے
اور شاعر کو فکر و نظر کی تازہ بستیاں آباد کرنے پر مائل کرتی ہے۔'

حکیم منظور کی شاعری میں جہاں تقریباً ہر مجموعہ شعر کی ابتداء حمد یا مناجات سے ہوتی ہے وہیں شاعر نے نعت گوئی کے فن کا بھی مظاہرہ کیا ہے حالانکہ نعت گوئی ایک مشکل ترین فن ہے اور نعت کہنا گویا دو دھاری تلوار پر چلنے کے مترادف ہے۔ لیکن شاعر اپنی balanced personality کی وجہ سے اس مشکل مرحلے کو بحسن وخوبی طے کر لیتے ہیں اور وحدت الوجود اور سرورِ کائناتؐ کی ذاتِ اقدس کو کبھی بھی ایک دوسرے میں حلول ہونے نہیں دیتے۔

تہہ در تہہ سب آئینے اور سارے رنگ محمدؐ کے
نقش تمام اک خواب مگر تعبیر محمدؐ اللہ ہو

مجھ کو اے منظور یہ احساس عاصی ہوں مگر
میرا شافع خود کرے میری سفارش یہ دعا

حکیم منظور کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو کی نقاب کشائی کرتے ہوئے حیات و کائنات اور رموزِ فطرت کا عمیق مشاہدہ کرتے ہیں۔ان کو صوفی بزرگوں کا دامن تھامنے میں ہی وسیلۂ نجات نظر آتا ہے۔ وادیٔ کشمیر چونکہ صوفیوں اور ریشیوں کی وادی کہلائی جاتی ہے۔شاعر کے دل سے ان بزرگوں کے تئیں عقیدت کے جذبات صفحۂ قرطاس پر شعری شکل میں نمودار ہوئے ہیں۔مثلاً

میں بس اس شیخ[1] کا معتقد منظور ہوں واللہ
وہ جس کا حصہ ہے کشمیر کی پوری علم داری

---

1. شیخ نورالدین ولیؒ

مندرجہ بالا شعر کی روشنی میں اگر حکیم منظور کے ایسے کلام کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ صوفیانہ رجحان رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں مسعود منور لکھتے ہیں:

"منظور مجموعی طور پر ہندوستان کی صوفیانہ شعری روایت کے جدید تر نمائندے ہیں۔ ان کی غزلیں کائناتِ اصغر اور کائناتِ اکبر کے باہمی رشتے کی آئینہ دار ہیں۔"[1]

حکیم منظور کے ہاں عشقِ حقیقی کے ساتھ ساتھ عشقِ مجازی کے بھی بھرپور نقشے کھینچے گئے ہیں۔ وہ دل کی کیفیات محبت کی واردات اور محبوب کے خوبصورت خدوخال کی سچائی بے تکلفی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ایسے اشعار میں پاکیزگی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے اور قاری کے ذہن میں ان کے محبوب کا ایک پاک مجسمہ ابھرتا ہے۔ شاعر خصوصاً سراپا نگاری کی کئی بہترین مثالیں پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

کیسا ہوتا ہے! چپ اس کی آنکھ کا حال
جیسے کوئی جھرنا گویا ہوتا ہے
کیسا ہوتا ہے کچھ کہنا اس لب کا
اک برگِ گل کی لرزش سا ہوتا ہے

ان سورج ہاتھوں میں چاند کے کنگن ہیں
وہ مکھڑا محتاج نہیں کسی گہنے کا

حکیم منظور کے ہاں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں ایک عام جذباتی انسان کے دھڑکتے دل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ایسے اشعار میں ایک رومانی شاعری کی طرح چاہتوں کے معرکے بہت ہی خوبصورتی سے طے کیے جاتے ہیں

[1]...... مسعود منور۔ خوشبو کا نام نیا (مجموعہ شعر حکیم منظور) سرورق

اور مختلف جذبوں کی لذتوں کا احساس پاکیزگی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسکے باوجود بھی اُنکے ہاں رومانیت برائے نام ہے جہاں وہ رومانی ہے وہاں رومانی سے زیادہ حسیّاتی ہے۔

چاہتا میں: بیاض جان پہ اسے
اَن کہے تازہ شعر سا لکھتا

میں شاخ شاخ اس کو جانتا ہوں، ثمر ثمر تازہ لذتوں تک
میں ایک موسم سا اسکو چاہوں، بدن کی ساری حرارتوں تک

گلابی صبحوں کا رنگ اسکا ہے آیتوں سا
وہ ایک چہرہ طرف طرف سے کتاب صورت

بے سماعت کا غذوں پر یہ اتر سکتی نہیں
اک چھلکتی نم بدن تصویر ان آنکھوں میں ہے

حکیم منظور یہ جانتے ہیں کہ ظاہر پرستی پر اکثر یقین کیا جاسکتا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ظاہر پرستی میں دھوکا ہوتا ہے۔ وہ بھی عام عاشق کی طرح جان کر دھوکا کھاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

یقین ظاہر پرستی اور ظاہر پُرفریب اکثر
وہ مرے ساتھ تھا لیکن وہ میرا ہم سفر کب تھا

حکیم منظور کا شعری سفر آدھی صدی سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے کئی روایات کو مٹتے اور بنتے دیکھا ہے اور ان سے تجربات حاصل کرتے چلے گئے ہیں۔ ان کی شعری دنیا کو پرسکون ماحول بھی میسر رہا۔ جس میں انہوں نے دنیائے شعر کو مختلف تجربات پر مشتمل بہترین شعری ادب فراہم کیا۔

لیکن بیسویں صدی کی آخری دہائی پُر آشوب رہی اور خصوصاً وادی گلپوش قتل و غارت گری سے لہو رنگ ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ حکیم جیسا حساس شاعر اس خون خرابے کا اثر کیسے نہ لیتا۔ وہ اپنی گرد و پیش کی زندگی میں تہذیبی، سماجی اور سیاسی حالات و واقعات کا درد مندی اور خلوص سے مطالعہ کر کے پوری فنی مہارت کے ساتھ شعری کینواس پر اتارتے ہیں اور ایسے اشعار ایک لاچار انسان کی بے بسی کے بہترین ترجمان ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

بدن کہ مور: مگر رقص بے ادا طاری
نظر فرات پہ: اک دشت کربلا طاری

لو گو لب کھولو کچھ بولو جہلم ہے مٹیالا کیوں
میں نے جب دیکھا تھا یہ تھا اک آئینہ سا

ان کے ہاتھوں میں یہ تلوار کہاں سے آئی
گل بہ گل خوئے ستم گار کہاں سے آئی
لمبے تھے کس کے ہاتھ نظر کس کی تنگ تھی
جہلم سے میرے کون روانی کو لے گیا

جواب کیا دوں یہ کس نے ہمارے جھرنوں پر
عجیب رنگ عجب بے زبانیاں لکھیں

حکیم منظور کے ہاں کشمیر کے عصری حالات جس طرح سے تخلیقی سطح پر اپنا اظہار پا رہے ہیں اس کی وجہ سے ان کی شاعری کو ایک نیا عنوان ملا ہے۔ خون ریزی، درد و کرب، خوف و خطر اور سسکیوں کے ساتھ ہی ساتھ عوامی نابرابری، عدم

تحفظ، بے یقینی اور اقتدار کی ہوس جیسے عنوانات ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ عطا کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار اس بات کی تصدیق کیلئے کافی ہیں:

اک کالے جادو کے سائے اس نگری پر ہیں
اس سے بچنے کے کچھ منتر ساتھ لئے پھرنا

کیا کروں تلوار رکھوں یا اٹھاؤں کیا کروں
بزدلوں کی بھیڑ ہے میری شجاعت زد پہ ہے
پیار وفا اخلاص کی وہ باتیں کرتا ہے
اپنے قبیلے کا وہ ایک ہی پاگل باقی ہے

ثمر شجر پھر ثمر شجر ہیں یہاں تو پتھر نہیں سلامت
غضب ہے ان پھول وادیوں میں کوئی بھی پیکر نہیں سلامت

میں کیا کروں آندھیوں کی یورش اگر ہے ہمسایہ گھر کی جانب
میں خود بھی کچھ کم دکھی نہیں ہوں کہ خود مرا گھر نہیں سلامت

دھواں کہیں سے اٹھے میں سوچوں جلا ہے کوئی چنار میرا
یہ خوف میراث میں ملا ہے یہی ہے اب اعتبار میرا

کچھ گلے کچھ بے یقینی کچھ شکوک
کچھ انہی سے رنگ سا رشتوں میں ہے

دکھ ہے سارے حق نوا ہیں سر جھکائے لب سئے
سانحہ: کرسی نشین ہیں بے ہنر سب کذب باف

مدت ہوئی کہ سیب اوراخروٹ کی جگہ
پکتی ہیں پیڑ پیر یہاں سازشیں کئی

پیڑ ہے سر سبز لیکن کچھ ہوا جس کے سبب
فاختہ کوئی بھی ان اطراف میں آئی نہیں

حکیم منظور کے ہاں کوہِ قاف اور پریوں کا ذکر جہاں خوش رنگ فضاؤں کو جنم دیتا ہے وہیں پر آشوب دور میں خوبصورت کوہِ قاف غم کا کوہ قاف نظر آتا ہے۔ جہاں شاعر کیلئے دلکشی کا کوئی بھی عنصر باقی نہیں بچا ہے۔ لیکن چونکہ حکیم منظور مثبت سوچ رکھنے والے شخص ہیں اور ایسے حالات سے نکلنے کیلئے فعال کوششوں میں سرگرم رہتے ہیں۔ وہ پورے ماحول میں ایک انوکھی تبدیلی کے طلبگار ہیں۔ لکھتے ہیں:

کچھ تو معمولی سی تبدیلی ہو معمولات میں
سنگ شیشوں کی کریں اب کے پرستش یہ دعا
پلٹ آئے گی کیا کشمیر کے چہرے کی شادابی
یہی کچھ سوچ کر بڑھتی ہے میرے دل کی بے تابی

میرے دامن میں ٹھنڈی دھوپ ہے: برفیلے سائے ہیں
ہے تیرے ہاتھ : یہ منظر بدل دینا خدا وند

پچھلے کچھ وقت سے حالات میں چنداں تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ لیکن سماج میں نفرت و جرائم کے جراثیم پھیل چکے ہیں۔ انسانی قدریں پامال ہو چکی ہیں۔

انسان خود ایک مشین بن کے رہ گیا ہے۔ محبت و اخوت جیسی قدریں نا دیدہ ہو رہی ہیں۔ رشتوں میں بے یقینی اور شکوک کے رنگ نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایسی عجیب رُت میں حکیم منظور کے دل کی خلش اور تڑپ ایسے اشعار کے ذریعے دیکھنے کو ملتی ہے۔

کہتا ہے کہ ہمدرد نئی رت ہے، یہ مانوں
دیکھوں نہیں ہاتھوں میں ہے دستار برابر

نئے شجر کی نشانی نہ کوئی پوچھ سکا
عجیب رُت ہے رہی لفظ سے زباں خالی

بادل کے تیور کہتے ہیں، بارش ہے دو چار قدم پر
لیکن کون یہ کہہ سکتا ہے، تر ہوں گے شعلوں کے آنگن

شاعر جہاں حشر سامانیوں کو دیکھ کر مایوس ہیں وہیں وہ ان حالات کا ذمہ دار خود انسان ہی کو ٹھہراتے ہیں کیونکہ انسان کی نیت میں کھوٹ آچکی ہے اور اپنی کم فہمی کی وجہ سے ہی وہ یہ مصیبتیں جھیلنے کیلئے مجبور ہے۔ انسان بظاہر ترقی کے اُن چھوئے میناروں تک پہنچ چکا ہے لیکن اخلاقی قدروں کی وہ بلند قامت عمارتیں مسمار ہو چکی ہیں جو اسکی بلند روایات کی مظہر تھیں۔ چنانچہ حکیم منظور لکھتے ہیں:

ہمیں نے ہاتھ کھینچے پیڑ بونے گل اگانے سے
ہمیں کم فہم کہتے ہیں خدا ناراض ہے شاید

دشت ہے اور ہم ہیں، پیغمبر نہ آئے گا کوئی
کیسے ممکن ہو ہمیں بھی چشمۂ زم زم ملے

سنگستاں میں رہتا ہوں منظور میں
میں حیراں سلامت ہے کس طرح سر
شیشے ہیں تہہِ سنگ تو گل و دِست ہوا میں
یہ کرب فقط میرے زمانے کیلئے تھا

حکیم منظور کے کلام میں صنعتِ تلمیح کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ جہاں اسلامی روایات اور مذہبی ارشادات و واقعات کو موضوع بنا کر جو اشعار لکھے جا چکے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ شاعر اسمِ اعظم کی عظمت و برتری تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

میرا عصا اسمِ اعظم منظور مجھے پروا نہیں
ہوں میرے دائیں بائیں جتنے چاہیں جادوگر

اسکے علاوہ حکیم منظور نے ہندو دھرم کی تاریخ کے کئی واقعات کو بھرپور طریقے سے شعری کینواس پر اتارا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس ضمن میں بطورِ مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

دنیا سے بے گانی دنیا والے کی جانی پہچانی[1]
پانی گاگر بنا جب اس کی ٹوٹی گاگر اللہ ہو

وہ لمحہ کتنا پاکیزہ ، کیسا سندر تھا یعنی جب
دو حصوں میں بٹتی دھرتی ہوئی برابر اللہ ہو[2]

ہو کے پنہاں جو کسی پاؤں کی زینت تھی کبھی[3]
آسماں پیوست وہ چمکیلی کالی آنکھ ہے

---

[1]...... مشہور کشمیر صوفی شاعرہ لل عارفہ کی طرف اشارہ

[2]...... سیتا ماتا کی طرف اشارہ

[3]...... شری کرشن کی وہ تیسری آنکھ جوان کے تلوے میں تھی۔

لاکھ رہیں یوسف کے بھائی سربستہ
جاگ اٹھیں گے چاہ کے پتھر بولیں گے

دشمن کی مدد پر تھے پسِ پردہ مرے بھائی
مجھ یوسف گم گشتہ کو ذات اپنی کمک تھی

میں بزدل ہوں کہ خود کھینچی ہے اپنی لکشمن ریکھا
تجاوز کر ہی لوں سنجیدگی سے بارہا چاہا

حکیم منظور ایسے خدشات سے باخبر ہیں کہ زبان کو اگر محدود دائروں میں رکھا جائے تو اسکی ترقی و ترویج کی راہ میں رکاوٹیں بھی آسکتی ہیں اور زبانوں میں ہو رہے روزمرہ تبدیلیوں سے روشناس بھی نہیں ہوا جاسکتا ہے۔ زبان کا مزہ تبدیل کرنے کیلئے حکیم صاحب کے قلم سے اس طرح کے اشعار بھی نکلتے ہیں:

کچھ بدل جائے سماعت اور تکلم کا مزاج
گھس گئے ہیں لفظ سب اک تازہ اکھشر بھیجنا

اکثر اشعار جن میں ہندی الفاظ کا بہت خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے مندرجہ ذیل ہیں۔

سگندھ، اکھشر، اتھاہ، گاگر، دھرتی، سندر، ریکھا، ایمان، منتر، پدھ، چکر، رتھ، نگری، امرت، درپن، ارپن، شبد، کارن، انت آکار، کتھا، پُن، پاپ، وشواس، پستکوں، آتما، دُردشا، شراب، پجاری، لکشمن ریکھا، نارد مُنی، اہنکار۔

ساتھ ہی رام، لکشمن، نارد منی، سورداس، اہلیا بائی جیسے عظیم مذہبی اور ادبی ہستیوں کا ذکر نہ صرف شاعر کی ہندی ادب سے واقفیت کا پختہ ثبوت فراہم کرتی ہے بلکہ اس بات کی بھی آگہی ہوتی ہے کہ شاعر زبانوں کی حدبندیوں کو قبول کرنے سے

انکار کرتا ہے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

میرا اردو سے تعلق تو دل وجاں کا ہے
اور سچ یہ بھی کہ ہیں ساری زبانیں میری

مجموعہ برف رتوں کی آگ میں شاعر نے ایک شعر کے ذریعے جو تقابلی جائزہ پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ساتھ ہی اس شعر کے ذریعے ساری رامائن کی کہانی ذہن میں ابھرتی ہے۔

کوئی نقش اجودھیا کا کیسے بنے
کوئی رام ہے اب نہ کوئی بھرت

سورداس، اہلیابائی کے ساتھ ہی ساتھ دمنیتی اور راجہ نل کا ذکر کر کے شاعر نے تاریخ کے بھی اوراق الٹ دیئے ہیں۔

حکیم منظور کا شعری اثاثہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ شاعر کا تعلق اردو کے حوالے سے پھول اور خوشبو جیسا ہے۔ اردو انکی مادری زبان نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اس زبان کے تئیں اپنا بھرپور حق ادا کیا ہے۔ اب جہاں کوئی زبان کسی شاعر یا ادیب کی رگ وپے میں اتر کر اسکے ایمان کا جز بن چکی ہو تو وہ کسی بھی صورت اس زبان کے وجود کے ساتھ چھیڑ خوانی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ بات تب صادق آتی ہے جب اردو زبان کا رسم الخط بدلنے پر مباحثے ہوتے ہیں چاہے وہ کسی سازش کے تحت ہی کیوں نہ ہو اور اس بحث میں اس زبان کے شیدائی بھی موجود ہوں۔ اور ان ہی کے ہاتھوں زبان کا قافیہ تنگ ہونے کے امکانات نظر آنے لگیں۔ حکیم منظور نے ایسے نام نہاد شیدائیوں کے نام ایک شعری مجموعہ انتساب کیا ہے (سخن برف زاد) جو اس زبان کا رسم الخط بدل کر اسے زندہ درگور کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن شاعر کو کامل یقین ہے کہ اردو کے خلاف یہ سازشیں کسی بھی صورت کامیاب نہیں ہو سکتی اور ہمارے خیال میں بھی جب تک اردو کے ساتھ حکیم منظور

جیسے دیوانہ وار محبت کرنے والے عاشق موجود ہیں ایسی کوششیں کبھی بھی بارآور نہیں ہوسکتیں۔ وہ لکھتے ہیں:

'اردو کے خلاف یہ ریشہ دوانیاں کبھی اور کسی بھی حال میں کامیاب نہیں ہوں گی اور اردو کبھی مٹ نہیں جائے گی۔ اسی لئے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کئے بغیر میں اس زبان کو وسیلہ اظہار بنائے ہوئے ہوں اور اردو کے ساتھ وابستگی میرے ایمان کا حصہ بنی ہوئی ہے۔''[1]

زندہ رہ جائے گی منظور زبانِ اُردو
چاہنے والا کوئی اس کا رہے نہ رہے

[1]......سخن برف زاد۔ حکیم منظور۔ بہ قلم خود

حکیم منظور کی نظم نگاری

نظم نگاری شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جس میں شاعر اپنے جذبات واحساسات اور تاثرات کو زیادہ روانی اور تاثر کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ حکیم منظور کے باطن کی تخلیقی شعلگی اور لوح وقلم سے ان کی قلبی وابستگی ہی کی وجہ سے وہ مسلسل انہماک اور تواتر کے ساتھ لکھتے رہے۔ جہاں انہوں نے غزلوں کی صورت میں اشعار کے دریا بہائے ہیں وہیں صنفِ نظم میں نہ صرف طبع آزمائی کی ہے بلکہ نظم کے ذریعے جذباتی تاثر اور تخلیقی آنچ کی تپش کو پوری شدت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حکیم منظور ایسا شاعر ہے جو اپنی راہیں خود بناتا ہے اور اپنی منزلوں کا تعین بھی خود ہی کرتا ہے۔ اپنے تخیل کے اظہار کیلئے جہاں وہ غزل کا سہارا لیتے ہیں وہیں اپنے خیالات کو راہ دینے میں صنف نظم کو نہایت موزوں ومناسب سمجھتا ہے۔

حکیم منظور بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے۔ یہ ان کے زور قلم کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اردو شعری سرمایے میں نظموں کے دو مجموعات کا اضافہ کر کے نظم کی طرف اپنی طبیعت کے میلان کا اظہار کیا ہے۔ حکیم منظور کا پہلا مجموعہ نظم ''پھول شفق آنگن کے'' نام سے جنوری ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ ۳۷ نظموں پر مشتمل ہے اور اس مجموعے کو حکیم منظور نے دنیا کے تمام اہلِ درد اور اہلِ دل کے نام انتساب کیا ہے۔ اس مجموعے کا پیش لفظ قاضی غلام محمد صاحب نے تحریر کیا ہے۔ نظموں کا یہ مجموعہ موجودہ دور کے تمام مسائل پر مبنی تجربات کی روداد ہے۔ ذاتی کشمکش کے ساتھ ساتھ عصری انتشار کو شاعر نے کامیابی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ نظموں کا مفصل جائزہ لینے سے قبل اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ آیا حکیم منظور نے شعوری طور پر صنفِ نظم کی مقبولیت کو تسلیم کیا ہے اور اپنے اظہار کو راہ

دینے کیلئے اس صنف کو مناسب و موزوں تصور کرتے ہیں۔ یا پھر صرف اپنے منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کیلئے وہ صنف نظم کی طرف راغب نظر آتے ہیں۔ دونوں مجموعوں پر سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حکیم منظور اپنے تجربات کو زبان دینے میں اور اپنے دل کی بات قاری تک پہنچانے میں نظم کا سہارا لینا مناسب سمجھتے ہیں۔ اپنی نظموں کے ذریعے وہ داخلی کشمکش اور خارجی تصادم کو بہترین طریقے سے ادا کرتے ہیں اور ایسے جذبات کو زبان دینے کیلئے انہیں صنف نظم سے زیادہ اور کوئی صنف مناسب نظر نہیں آتی۔ حامدی صاحب رقمطراز ہیں:

'ان کی (حکیم منظور) غزلوں کے کئی مجموعوں کی متواتر اشاعت نے میرے ذہن پر یہ تاثر گہرا کر دیا تھا کہ وہ بھی متعدد معاصر شعراء کی طرح غزل ہی کے جذب و کشش کے اسیر ہیں اور وہ نظم گوئی منہ کا مزا بدلنے کیلئے روا رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی تازہ نظموں نے میرے اس خیال کا ابطال کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ پوری طرح قوت، جدت اور صلابت فکر کے ساتھ نظم گوئی پر حاوی ہیں'[1]

'پھول شفق آنگن کے' حکیم منظور کا یہ مجموعہ خوبصورت نظموں کا معرکہ ہے۔ اس میں حکیم منظور نے علامت کے تحت انسان کے قوت ارادی، ماحول اور حالات کی بے سروسامانی کی خاصی طویل گفتگو کی ہے۔ 'پھول شفق آنگن کے' میں زیادہ تر آزاد نظمیں شامل ہیں اور اکثر نظمیں بے عنوان ہیں۔ حکیم منظور کی نظموں کا محور انسان کی ذات، کائنات کی نیرنگیاں، مٹتی ہوئی اقتدار کے ساتھ عصری پیچیدگیاں اور داخلی و خارجی تصادم آرائیاں ہے۔ یوں تو نظموں کے ذریعے ایک لینڈ سکیپ فراہم کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ لیکن حکیم منظور کیلئے یہ عمل بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے شخصی رد عمل کو لفظوں میں منتقل کر کے نہ صرف اپنے ذہنی بحران سے

---

[1]...... حامدی کاشمیری۔ پیش لفظ۔ 'برفاب' مجموعہ ص۔ ۸

نجات حاصل کرلی ہے بلکہ ناقابلِ تسخیر جذبوں پر فتح پا کران چھوئے اور اچھوتے خیالات کو زبان عطا کی ہے۔ ایسے شعراء نظم گوئی کے میدان میں بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں حامدی صاحب لکھتے ہیں:

'ایسے شعراء کی ہر زمانے میں تعداد کم ہی ہوتی ہے جو صبر آزما اور متخالف حالات سے گرم جدال رہتے ہوئے بھی شکستِ دل کو اپنا مقدر نہیں بناتے بلکہ اس کے برعکس ذہنی بعد کو قائم کر کے اس کا 'تماشا' کرتے ہیں اور اپنے شخصی ردعمل کو لفظوں میں منتقل کرتے ہیں۔ حکیم منظور ایسے ہی معدودے چند شعراء میں شامل ہیں اور پوری آگہی اور قوت سے اپنے ناقابل تسخیر جذبے کی بدولت اپنی شعری بقاء کا سامان کرتے ہیں'[1]

حکیم منظور قاری کو نظموں کے آئینہ خانوں میں لے جاتے ہیں جہاں اسے گردوپیش کی زندگی اپنے تقاضوں، الجھنوں، تصنع کاریوں، فریب کاریوں، مجبوریوں اور محرومیوں کے ساتھ نظر آتی ہے اور اسے اپنے عصر کے آشوب کا احساس گہرا ہوتا ہے۔ حکیم منظور بنیادی طور پر حساس طبیعت رکھتے ہیں۔ انکے سینے میں ایسے لوگوں کیلئے درد کے دریا موجزن ہیں جنکا احساس مردہ ہے۔ جب کسی فرد یا جماعت کا احساس مر جاتا ہے تو اسکی تمام تر قوتیں سلب ہو جاتی ہیں اور وہ صمٌ بکمٌ، امیٌ کی بجا تفسیر بن جاتے ہیں۔ حکیم منظور نے ایسے ہی بے نوا لوگوں پر مرثیہ لکھا ہے جو بے خبری اور اطمینان کی چادر تانے زندگی گزار رہے ہیں۔ دراصل ایسے لوگوں کا جینا جینا نہیں بلکہ ان کی بے عملی خودکشی کے مترادف ہے۔ بادل، برق، آندھی زندگی کی علامات ہیں۔ جو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ برتی گئی ہیں۔ اس نظم کے ذریعے شاعر عمل اور مسلسل عمل کی تلقین کرتا ہے کیونکہ عمل ہی سے زندگی میں رنگارنگی ہے۔

[1]...... حامدی کاشمیری۔ پیش لفظ (برفاب آفتاب، حکیم منظور) ص ۷

حکیم منظور نے زندگی کی شاندار اقدار وروایات کے تئیں عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ماضی کی کھٹی میٹھی یادیں انکے لئے کسی اثاثے سے کم نہیں۔ حکیم منظور کو شدت سے اس بات کا احساس ہے کہ قدروں کے تنزل کی وجہ سے انسان کی پہچان گم ہو رہی ہے۔ اسی لئے وہ کھوئی ہوئی پہچان کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اس جہانِ رنگ وبو میں کئی چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے شاعر ماضی کی شیریں یادوں میں گم گشتہ صداؤں کے تعاقب میں رواں دواں رہتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بے عنوان نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

'برف تو اب بھی چپکے سے راتوں کے اندھیارے میں آتی ہے
بند مگر پٹ ہر کھڑکی کے
خوشبو چائے کی کتلیوں سے اڑتی نہیں ہے
میری بیوی کانگڑیاں سلگانے کے فن سے عاری ہے
الٹ پلٹ ہر بات ہوئی ہے
باقی ہیں کردار کہانی روٹھ گئی ہے"

نظم کے آخری مصرعے میں المیہ کیفیت کا اظہار ملتا ہے جو شاعر کے اندرونی کرب کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی مجموعے کی ایک اور بے عنوان نظم جو شاعر کے ذاتی کرب کی بھرپور غمازی کرتی ہے۔ اس نظم کا پہلا مصرعہ ہے 'میں ظالم ہوں'۔ یہ نظم تین حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصے کی شروعات اسی مصرعے سے ہوتی ہے اور نظم کے اختتام پر بھی یہی مصرعہ دہرایا گیا ہے۔ اس نظم میں طنزیہ اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ اور شاعر کے طنز کا نشانہ کوئی اور نہیں بلکہ خود اسکی ذات ہے۔ نظم کا آخری حصہ ملاحظہ ہو:

'میں ظالم ہوں
میں نے اپنے عمل کو اب تک

بازاروں میں بیچنے کی کوئی سعی نہیں کی
میں نے اپنی سوچ کے ابتک دام کما کر
نام کمانے کا ہر موقعہ کھوڈالا ہے
اوروں سے انصاف کی خاطر
اپنے آپ پہ ظلم کیا ہے
میں ظالم ہوں!'

حکیم منظور کو اقدار صالحہ کی پاسداری کی پامالی کا شدت سے احساس ہے۔ پھول شفق آنگن کے میں کئی نظمیں ایسی ہیں جہاں سماجی اقدار کی شکست وریخت پر شاعر واویلا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ گزرے ماضی کی شاندار روایات کو محفوظ کرنے کیلئے کسی کے پاس وقت نہیں۔ لوگ انہیں قصہ پارینہ سمجھ کر بھلا بیٹھے ہیں۔ اس سلسلے میں حکیم منظور کی یہ مختصر نظم جو حکایتی شکل میں پیش کی گئی ہے ملاحظہ ہو:

'فارسی مکتب کی کھڑکی پر ہمیشہ
ایک کوا: روز آ کر بیٹھتا تھا
اُس نے اک دن مولوی صاحب کو یہ کہتے سنا
'گر حفظِ مراتب نہ کُنی زندیقی'
پھر کبھی
کوے نے اپنے گھونسلے کے پاس رہنے والے اجلے پر کتو بر سے
نگاہیں چار کی ہوں
یہ نہیں دیکھا گیا
ہاں مگر جب ایک دن
چند لڑکے
مولوی صاحب کی پگڑی ہاؤں پاؤں روندتے تھے

کالا کوا: بے زبان، صورت شکستہ
فارسی مکتب کے اجڑے صحن میں
مردہ پڑا پایا گیا۔' صفحہ ۲۸

اس نظم کے تجزیاتی مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کالے کوے نے حفظ مراتب کی پاسداری کی اور اُس سے اِس قدرِ صالحہ کی پائمالی نہ دیکھی گئی اسی نظم کا جائزہ لیتے ہوئے قاضی غلام محمد لکھتے ہیں:

'یعنی کوا مرا بھی تو اسی مکتب کے اجڑے صحن میں، کیونکہ وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے۔ 'اجڑے صحن' کا ٹکڑا اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ مدت سے مکتب کی عمارت کی مرمت نہیں کی گئی ہے۔ یعنی مکتب اب ویراں ہے اور اسکے ساتھ کے تمام تلازمات بھی قصۂ پارینہ ہو چکے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ It is a great little poem اور کالا کوا اقدارِ صالحہ کے پاسبان اور امین کی علامت ہے۔'

'کھوئی ہوئی میراث کی بازیافت کی دعا'

یہ نظم بھی مندرجہ بالا نظموں کی قبیل میں سے ہے جو قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ اس نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو۔

'جانے وہ بادل کہاں سے آ گیا
جس نے صحرا کو سمندر کر دیا
آفتابی لمحہ تھا، منظر کا منظر جل گیا
اب فقط اک تذکرہ ہے جسکی تفسیروں میں پورا واقعہ پنہاں ہوا ہے
اک دھواں ہے
لمحہ لمحہ جس کا چہرہ اک نئی تصویر کا رخ دھارتا ہے

کیا یہ ممکن ہے کہ میں کھوئے منظر کو پھر سے پا سکوں

اے خدا ابتداء وانتہا

اے خدا

میرے خدا'

(کھوئی ہوئی میراث کی بازیافت کی دعا صفحہ۔۱۳)

حکیم منظور کی اکثر نظمیں ایسے ہی خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔ لیکن پھول شفق آنگن کے میں کئی نظمیں ایسی بھی ہیں جو فطرت کی نیرنگیوں کی ترجمانی میں خوبصورت حقائق کا انکشاف کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایسی نظمیں بعض اوقات اساطیری اور مافوق الفطری بھی لگنے لگتی ہیں۔ تخیل کی بلند پروازی قاری کو خیالات کے اعتبار سے بہت دور لے جاتی ہے جیسے کہ 'خواب کہانی' نظم کا پہلا ہی مصرعہ قاری کو طلسماتی دنیاؤں کی سیر کراتا ہے۔ مصرعہ یوں ہے:

'قاف کی پریاں آنگن آنگن ناچیں گی'

'خواب کہانی' میں ان رنگیں خوابوں کا تذکرہ ہے۔ شاعر جن کا خریدار بننا چاہتا ہے اور جنکے عوض وہ ہاتھ، زبان، گفتار، سوچ سب گروی رکھتا ہے۔ یہ شاعر کا ایسا اثاثہ ہے جن کے بغیر زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ نظم کا اختتام المیہ ہے۔ آخر میں شاعر کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا نہ ہی سنہری خواب اور نہ ہی گروی رکھا گیا اس کا اثاثہ۔

حکیم منظور رموزِ حیات کے گہرے نکات سے واقفیت کے خواہاں ہیں۔ لیکن دنیاوی الجھنوں کو یکسر ترک کرنے کا حوصلہ نہیں جٹا پاتے۔ پھول شفق آنگن کے میں شامل ایک بے عنوان نظم کا مردِ دیگر بھی گوتم بدھ کی طرح گیان حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن دنیاوی مصروفیات اسکے حوصلوں کو پست کر دیتی ہے اور رشتوں کے بندھن روحانیت کے راستے پر چلنے سے روکتے ہیں۔ حکیم منظور نے اپنی شاعرانہ خوبیوں کا استعمال کرتے ہوئے معمولی خیال کو فلسفیانہ پیرائے میں پیش

کر کے اچھوتا اور نادر موضوع بنا دیا ہے۔ اس نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجئے:

جب بھی گوتم بننا چاہا مجھے لگا
جیسے
میرے بچے کی معصوم نگاہیں پوچھ رہی ہوں
ڈیڈی! مجھ کو چھوڑ کے تجھ کو کس جنگل میں گیان ملے گا
میں کس سے اسکول کی فیس، کتابیں اور کپڑے مانگوں گا
مجھ کو کیسے گیان ملے گا؟
میں مدت سے سوچ رہا ہوں
گوتم کیسے اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ کے گھر سے بھاگا تھا؟

برف آفتاب حکیم منظور کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس کا سال اشاعت ۲۰۰۰ء ہے۔ یہ مجموعہ کل ساٹھ نظموں پر مشتمل ہے۔ حکیم منظور نے اس مجموعے کو مشفق اور مہربان دوست مدیر آفتاب خواجہ ثناء اللہ بٹ کے نام انتساب کیا ہے اور اپنے عزیز دوست ظریف احمد ظریف کی نذر اس مصرعے کے ساتھ کر کے

'تو بہر رنگ رہا میرے خیالوں میں شریک'

اپنی دوست پروری کا ثبوت فراہم کیا ہے

برفآفتاب کی پہلی نظم 'سرگزشت' کے نام سے ہے۔ جس میں حکیم منظور نرے مفکر نظر آتے ہیں۔ اس نظم میں حکیم منظور نے تاریخ کے وسیع اور طویل واقعات کا محاکمہ الفاظ کے خوبصورت جامہ میں سرگزشت کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔ نظم کی ابتداء وہ اس شعر سے کرتے ہیں:

'جو سوچتا تھا میرا دل وہ آنکھیں کہتی تھیں
جو آنکھیں دیکھتی تھیں، لب اسے ادا کرتے'

اس نظم میں جو سب سے بڑی کیفیت سامنے آتی ہے وہ احساسِ شکستگی

ہے۔جس میں شاعر کی ہر لے بے ثباتی کی تان پر آ کر ٹوٹتی ہے۔شاعر نظم کے نفسِ مضمون میں کائنات اور انسان کی مختلف کیفیات کو مختلف رنگوں میں بیان کرتا ہے۔ یعنی کائنات کے عناصر میں کبھی وہ گلاب کے پھول کا تذکرہ کرتا ہے کبھی چمن کی بہار آفرینی کا۔اور جب انسان کی موجودہ صورتحال کا تذکرہ کرتا ہے تو اسکا حال ماضی سے بہتر نظر آتا ہے۔ساتھ ہی اسے زندگی کی بیشتر راہیں بھی ناہموار نظر آتی ہیں۔شاعر اپنے نیک خصائل کا علم رکھتا ہے۔لیکن وقت کی آلودگی ان نیک خصائل کو آلودہ کر دیتی ہے۔شاعر کے دل میں جذبۂ محبت باقی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسکا وجود قائم دائم ہے۔

'امید فردا' ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر ایک شکست خوردہ ماحول سے فرار حاصل کر کے مستقبل کو خوش آئند بنانے کا خواہاں ہے۔اس نظم میں الفاظ اور مصرعوں کی ساخت کے پس منظر میں ایک تاریخی تصور نظر آتا ہے۔جو عالمی سطح پر بالعموم اور ریاستی سطح پر بالخصوص بدلتے ہوئے سیاسی،سماجی اور تہذیبی حالات کے جائزے پر مبنی ہے۔اس نظم کا فنی حسن اسکا استفہامیہ انداز ہے۔نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو:

'میں کس سے پوچھوں
وہ کونسا سال تھا کہ جس میں
ہمارے جہلم کے پانیوں کی روانیوں کا مزاج بدلا
ہماری سیرابیوں سے وابستہ تھیں جوان سب کہانیوں کا مزاج بدلا
مکاں ہمارے تھے کچے،مٹی کے چھت تھے ان کے
بہار آتے ہی سب چھتوں پر گلاب اُگتے'

اُمیدِ فردا صفحہ ۱۷

اس نظم میں مضامین کی کیفیت اتنی خوبصورت اور ہمہ گیر ہے کہ قاری کی نظر ان پر سے ہٹنے کا نام نہیں لیتی خیالات کی زریں لہروں کی کارفرمائی چھپائے نہیں

چھپتی۔ شاعر کے ذہن میں خیالات یوں وارد ہوتے ہیں جیسے 'صریر خامہ پر نوائے سروش' وہ استفہامیہ انداز میں ہر ایک خوبصورت شے سے یہ سوال کرتا ہے کہ وہ اصلی حال و رنگ میں کیوں نہیں۔ یہاں ایک مصرعہ انتہائی قابل غور ہے۔

'ہمارے جہلم کے پانیوں کی روانیوں کا مزاج بدلا'

اس مصرعے میں اس خواہش کا پتہ چلتا ہے جو شاعر کے دل میں کروٹیں لے رہی ہیں۔ وہ ماحول میں پہلی جیسی تبدیلی چاہتے ہیں۔ اس نظم کے تین بند ہیں۔ ہر بند کی شروعات ایسے مصرعے سے ہوتی ہے جس کا انداز استفہامیہ ہے۔ یعنی

'میں کس سے پوچھوں'

نظم کا نفس مضمون اُمیدِ فردا ہے۔ اس نظم میں جہاں ایک طرف اپنے زاد و بوم کے حوالے سے ماضی کے قابلِ احترام رشتوں کی پامالی کا نوحہ ہے۔ وہیں وہ امید فردا کے احساس کو بھی جگاتا ہے۔

'خدا کی اس سرزمین پہ اب بھی
کوئی تو ہوگا ہی جس کے لب کی بس ایک جنبش سے کام ہوگا'

اُمیدِ فردا صفحہ ۱۸

اس آخری مصرعے میں شاعر نے اُمیدِ فردا کی تمام خواہش کو کامیابی کے ساتھ سمیٹا ہے۔ اپنی کھوئی ہوئی شناخت حاصل کرنے کی جو للک شاعر کے دل میں پوشیدہ ہے۔ آخری مصرعے میں اسکا اظہار کیا گیا ہے اور وہ کھوئی ہوئی شناخت کسی کے ہونٹوں کی ایک جنبش سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس آخری مصرعے میں لفظ 'کوئی' کا استعمال کر کے شاعر نے نظم میں تجسس کی کیفیت پیدا کر لی ہے۔ قاری کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ لفظ 'کوئی' سے مراد کیا کوئی سلطان یا حاکم ہے جس کی حکومت کے بدلاؤ میں وقت کا نظام ٹھیک ہو سکتا ہے یا یہ 'کوئی' کسی ولی، غوث قطب یا ابدال کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لب کی ایک جنبش یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ کوئی واقعی ولی

یا غوث ہی ہوسکتا ہے کہ جس کی دعاؤں کے کرشمے سے حالات کا یہ دگرگوں منظر اپنی اصلی صورت میں لوٹ سکتا ہے اور فقط لب کی ایک معمولی جنبش سے حالات کا بہتر ہونا کسی کرامات سے کم نہیں۔

برف آفتاب کی تمام نظموں میں تواتر اور مطالب آفرینی کی کیفیات ابھر ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ایک کے بعد ایک نظم ایسے معلوم ہوتی ہے جیسے موتیوں کی مالا ہو۔ اسی مجموعہ میں شامل ایک نظم 'جہاد' کے عنوان سے ہے۔جس میں شاعر اصولِ دین پر کاربند نظر آتا ہے۔ دین کے پس منظر میں جہاد کے معنی وضاحت کے ساتھ سمجھائے گئے ہیں۔ جہاد کے طریقۂ کار اور اصولوں پر سیر حاصل بحث ہوئی ہے کہ جہاد کب اور کن حالات میں لازم ہے۔شاعر جہاد کو دین کا اصول اسلئے قرار دیتے ہیں کیونکہ جہاد ہی سے غیر ممکن کو ممکن کیا جاسکتا ہے۔ وہ جہاد کی وضاحت کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

'جہاد پر یقین سے لہولہو میں گرمیاں
جہاد سے اگیں گی سنگ زار سے بھی نرمیاں
جہاد سے ہوں دشت میں بھی خوشبوؤں کے قافلے رواں دواں
اسی لئے جہاد میرے دین کا اصول ہے'

جہاد/ص۔۶۳

نظم کے دوسرے حصے میں شاعر کئی ایسے اعمال اور اشیاء کی نشاندہی کرتا ہے جن کے خلاف جہاد نہ صرف جائز ہے بلکہ لازم بھی ہے۔چند ایک بطور مثال پیش ہیں:

'جہاد موت کے خلاف زندگی کے واسطے
جہاد رات کے خلاف روشنی کے واسطے
جہاد جنگ کے خلاف آشتی کے واسطے

جہاد ظلم کے خلاف عدل کی صداقتوں کے واسطے
جہاد نفرتوں سے اور محبتوں کے واسطے
جہاد شام رنگ سے مگر حسین ساعتوں کے واسطے
جہاد چشم تنگ سے دل ونظر کی وسعتوں کے واسطے'.......... جہاد۔ص۔۶۳

شاعر نظم کے آخر میں اس چیز کی زوردار الفاظ میں مذمت کرتے ہیں جہاں سماج میں رہتے ہوئے ہر فرد ایک دوسرے کی عیب جوئی کیلئے تیار رہتے ہیں۔ دراصل یہ عمل کسی فساد سے کم نہیں۔ شاعر کے نزدیک اصل جہاد وہ ہے جو اپنے نفس کے خلاف لڑا جائے۔ اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پانا ہی اس کے لئے سب سے بڑی فتح ہوگی۔ نفسِ امارہ کی تسخیر کے بعد ہی ایک انسان تسخیرِ کائنات کو ممکن بنا سکتا ہے۔ مندرجہ بالا نظم کے حصے میں شاعر جس طرح کے جہاد کی تلقین کرتا ہے وہ یقیناً جہاد کی ضمنی اور چھوٹی قسمیں ہیں۔ جو شاعر نے یکے بعد دیگرے شعری کالم میں بیان کی ہیں۔ نظم کے وسط میں شاعر ان اقسام کے باہر جہاد کے نام پر کئے گئے کسی بھی عمل کو فساد قرار دیتا ہے۔ اس نظم میں شاعر کھل کر موجودہ صورتحال کی طرف انگشت نمائی کرتا ہے۔ نظم کا اجتماعی نفسِ مضمون قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔

برفِ آفتاب کی نظمیں ہمہ جہت کیفیات کی غماز ہیں۔ مختلف نوعیت اور مختلف موضوعات پر مبنی نظمیں اس بات کی دلالت کرتی ہیں کہ شاعر کا دائرہ سوچ وفکر بہت وسیع ہے۔ اس مجموعے پر تمثیل وعلامت کا وجود حاوی نظر آتا ہے یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ وجود شاعر کے تخیل کا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ برفِ آفتاب میں ایک نظم 'نظم لکھی جائے کس پر' کے عنوان سے ہے۔ اس نظم میں بیک وقت دو کیفیات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ ہر شے کا وجود سے ثبات ہے یعنی اسکا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ جب وجود ہی نہ ہو تو اسکا تذکرہ کیا ہوسکتا ہے۔ یہ ایک معنی خیز اشارہ ہے۔ اس نظم میں جو دوسری کیفیت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ مختلف مناظر اور اشیاء کی رنگا رنگ

بوقلمونی ہے یعنی اس نظم میں جن چیزوں کا انتخاب ہوا ہے وہ اپنے حسن وشباب میں اوجِ کمال پر دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن اپنے آپ میں ادھوری ہیں۔ "نظم لکھی جائے کس پر"، نظم میں شاعرانہ لہجے کے ساتھ ایسا حقیقت پسندانہ نظریہ پیش کیا گیا ہے جو فقط حکیم منظور کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہوسکتا ہے۔ سائنسی نقطہ نظر کے ساتھ شاعر نے جُز اور کُل کے باہمی رشتے کو خوبصورت شعری پیکر عطا کیا ہے۔ حکیم منظور کی اس نظم کو ایک کامیاب شعری تجربے کے طور پر لیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے شاعرانہ انداز میں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ مشترک اور مرکب اجزا ہی کسی پیکر کا وجود ممکن بناسکتے ہیں۔ جس کو ایک مکمل طاقت کے طور پر استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

حکیم منظور نے کثیر الجہت شعری منظر نامہ پیش کیا ہے جسکے پس منظر میں ان کے عمیق غور وفکر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ کائنات کے حقیر اجزاء کو اپنے دائرہ مطالعہ میں شامل کر کے انہیں آفاقیت بخش دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں قاضی غلام محمد رقمطراز ہیں:

> "حکیم منظور کی شاعری کے حوالے سے بات کیجئے تو یہ بات آئینہ ہوجاتی ہے کہ یہ حساس اور گہری سوچ کا حامل شاعر کس مواد سے اور کس طرح اپنے اصنام خیال تراشتا ہے۔"[1]

شاعر کی مذکورہ نظم علامتی رنگ میں لکھی گئی ہے۔ اور ایسے عناصر کا ذکر کیا گیا ہے جنکا انحصار بڑی حد تک دوسری چیزوں پر ہے۔ جیسے خوشبو، رنگ، بادل، آب، آتش، خاک یہ عناصر ایسے ہیں جنکا وجود عدم ہے۔ نظم کے آخر میں شاعر اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ وہ کسی ایسے چیز پر نظم لکھنے کا خواہاں ہے جس کا اپنا کوئی وجود ہو یا اس شے کا شاعر کی سوچ سے مماثلت ہو یا پھر وہ چیز شاعر کے بیان کی تشفی کیلئے کوئی جواز پیش کرسکتی ہو یا پھر جسے کوئی خوبصورت منظر ابھر کر سامنے آئے جو کہ

[1]..... قاضی غلام محمد۔ پیش لفظ (پھول، شفق آنگن کے، حکیم منظور) ص ۲

پائیدار اور مستقل ہو۔ نظم کا آخری بند ملاحظہ کیجئے:

'آیئے اب فیصلہ کرلیں یہیں
آب و آتش خاک و باد
پھول، خوشبو، رنگ، بادل
جمع ہوتو بات ہے
ورنہ تنہا ان کے معنی کچھ نہیں
نظم لکھی جائے جب ان سب سے اک پیکر بنے
میری سوچوں کے مماثل جب کوئی منظر بنے'۔

(نظم لکھی جائے کس پر) ص۔۷۵

اس نظم میں الفاظ کے جامے میں ایسی خوبصورت تصویریں پیش کی ہیں جنہیں پڑھ کر قاری مبہوت ہو جاتا ہے۔

حکیم منظور موضوعات کے بھی شاعر ہیں۔ دعائے خاص، جہاد، ہوس اظہار اور شہر آشوب اسکی مثالیں ہیں۔ ایسے موضوعات ان کے ہاں فقط خارجی رنگ و روپ میں پیش نہیں ہوتے بلکہ شاعر کے داخلی جذبے کی رنگت کی آمیزش شامل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں 'نظم' ایک کہانی اور حادثۂ جانکاہ' قابلِ مطالعہ ہیں۔ حامدی صاحب اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

'وہ (حکیم منظور) محض موضوعیت کی ترسلیت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنی شخصیت کے جذبے کے ساتھ تعقل کو متحرک کر کے موضوع کو داخلی رنگ عطا کرتے ہیں'۔[۱]

نظم 'دعائے خاص' حکیم منظور نے اپنے فرزند حکیم آفاق کے جنم دن پر لکھی ہے۔ یہ نظم دونوں مجموعوں ''برفآفتاب''، ''پھول شفق آنگن کے'' میں شامل ہے۔

۱۔۔۔۔۔حامدی کاشمیری۔ پیش لفظ (برفآفتاب، حکیم منظور) ص۔۱۲

اس نظم کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا وجود ادھورا تھا۔ فرزند کا تولد ہی ان کی شخصیت، ان کے وجود کی تکمیلیت کا باعث ہے۔ یہ نظم شاعرانہ خوبیوں کی مکمل تفسیر ہے۔ شاعر اپنے فرزند کو حرفِ معتبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور برسوں سے جس ہمسفر کی انہیں تلاش تھی وہ تلاش مکمل ہوئی ہے۔ اس نظم میں شفقتِ پدری کے تمام تر جذبات کی عکاسی نزاکت کے ساتھ ہوئی ہے۔ یہ نظم دعاؤں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دعاؤں کا لشکر بارگاہ الٰہی میں قبولیت کا شرف حاصل کرنے کیلئے بے قرار ہے اور یہ تمام تر دعائیں ایک باپ کے دل سے نکلی ہوئی نیک خواہشات کا مظہر ہیں۔ نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

'خدائے ذوالکرم ہمیشہ تم پر مہرباں رہے
تمہارے ہر قدم پہ اس کا سایۂ اماں رہے
جدھر جدھر سے تم چلو وہیں یہ خوشبوئیں ہوں نغمہ زن
جدھر رکیں قدم تمہارے اس جگہ بہار بھی ہو خیمہ زن'

(دعائے خاص صفحہ)۔۱۱۵

یہ نظم دراصل تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں شاعر کے وجود کی تکمیلیت کا تذکرہ ہے۔ دوسرے حصے میں بیٹے کیلئے دعائیں مانگی گئی ہیں اور تیسرے حصے میں چند نصیحتیں کی گئی ہیں جن پر چل کر زندگی کو خوشگوار تر بنایا جا سکتا ہے۔ آخر میں دعائے خاص مانگ کر نظم کا خاتمہ ہوتا ہے۔ نظم کا تیسرا حصہ جہاں باپ اپنا فرض ادا کرتے ہوئے بیٹے کو مکمل اور پاکیزہ زندگی گزارنے کیلئے چند نصیحتیں دیتا ہے۔ بطور خاص ملاحظہ کیجئے:

"تمہارے لب پہ ہو حدیثِ دلبری
رہیں تمہاری آنکھ میں محبتیں بھری بھری
دوئی نہ نفرتوں کا ہو کبھی تمہارے دل کی راہ سے گزر

تمہیں عناد و بغض سے خدا عطا کرے حذر

تمہارے لب سے ہوا دا وہی جو لوح دل پہ ہو

خدا کی ذات پر نظر، بھروسہ اپنے آپ پر

نظر دھنک ہو اور تمہارا دل گلاب جیسا تر

تمہیں عطا ہو لا زوال زندگی کی سروری

تمہیں نصیب ہوں ہزار بار دیکھنا اسی طرح سے ماہِ جنوری'

(دعائے خاص) صفحہ۔۱۱۷

حکیم منظور کے مجموعے برفآفتاب میں، ہوسِ اظہار کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے۔ شاعر نے اس نظم میں دراصل خواہش کو ہوس کا نام دیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خواہشات اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خدا کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق جن میں جمادات، نباتات اور حیوانات شامل ہیں سبھی کے اندر ہوس کا جذبہ موجزن ہے۔ اسی ہوس کے باعث ہر شے اپنی تکمیلیت کیلئے کوشاں رہتی ہے۔ یہ موضوع اپنے آپ میں وسعت اور آفاقیت رکھتا ہے۔ جس کو شاعر نے بصیرت افروز پیرائیہ میں بیان کر کے اور بھی بسیط اور وسیع بنا دیا ہے۔ دراصل شاعر وجدان کی گفتار کی ہوس اور اپنے اظہار کی ہوس کی ثبات چاہتا ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر ایک باذوق قاری بلند تصورات وخیالات سے گزرتا ہوا شاعر کی شعری وادی میں داخل ہوتا ہے اور ایسا محسوس کرتا ہے کہ شاعر نے گونگے الفاظ کو زبان عطا کی ہے۔ اس سلسلے میں نظم کا آخری حصہ ملاحظہ ہو۔

'ہوس لفظوں کو اس گفتار کی جس میں وہ ظاہر ہوں

ہوس گفتار کی اک لے نئی، تازہ، سلگتی سی

اسی لے کو زبان کی نے مسلسل ڈھونڈتی ہے

وہی لے ہے ہوس وجدان کی گفتار کی شاید

ہوس بس اک ہوس ہے خود میرے اظہار کی شاید

(ہوس اظہار۔صفحہ)

مندرجہ بالا نظم کا حصہ حکیم منظور کے اپنی شعری اظہار پر دلالت کرتا ہے۔خود اپنے کلام کے ذریعے اپنی ذات کا انکشاف کرنا شاعر کے نزدیک دراصل اظہار کی ہوس قرار دی جاسکتی ہے۔

حکیم منظور کی نظموں کا ہیرو یا مردِ دیگر اپنے رویے اور طرزِ فکر کے حوالے سے سادہ اور شفاف ہونے کے باوصف یک رخی نہیں۔کئی نظموں میں یہ مردِ دیگر اپنی موجودگی کا پتہ دے کر بلاواسطہ شاعر کی منقسم شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔شاعر ہر پل اس کے ساتھ تصادم آرائی میں مشغول رہتا ہے۔یہ مردِ دیگر کئی شکلوں میں قاری کے سامنے آتا ہے۔کبھی یہ استحصال کرنے والا رقیب، سیاست گر تو کبھی مدعی، غاصب یا مدمقابل۔دراصل نظموں کے پس پردہ یہ ہیرو شاعر کا غیر خود ہے۔جو شاعر کے ساتھ متصادم ہونے کیلئے ہر پل انہیں اکساتا رہتا ہے۔اس سے حکیم منظور کی نفسیاتی شخصیت کی آویزش نمایاں ہوتی ہے اور ان کی نظمیں جہت آشنا شکل اختیار کرتی ہیں۔اس سلسلے میں حامدی صاحب رقمطراز ہیں:

"حکیم منظور کی نظموں میں جو Protagonist نمود کرتا ہے وہ قاری کو اپنے جذباتی خلوص، سادگی اور دانشورانہ آگہی سے فوری طور پر اپنی جانب راغب کرتا ہے۔یہ کردار نظموں کی دنیا میں سانس لیتے ہوئے بھی باہر کی دنیا کیلئے اجنبی یا بے گانہ نہیں۔سچ تو یہ ہے کہ خارج کی دنیا سے اس کی شتگی اتنی واضح ہے کہ اس پر باہر کی دنیا کی پیداوار ہونے کا گماں ہوتا ہے اور وہ اپنے خالق سے الگ نظر نہیں آتا، تاہم اپنی فنکارانہ شناخت کیلئے وہ تخیلی دنیا میں مراجعت کرتا ہے۔اس طرح سے اندر اور باہر کے درمیان کا

فاصلہ موہوم ہو جاتا ہے اور کردار کی آواز شاعر کی آواز ہو جاتی ہے۔ بے ساختہ، فطری اور پرتاثیر'[1]

'بزدلی ایک عذاب ہے۔' حکیم منظور کی ایک نمائندہ نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر کا مردِ دیگر مضبوط ارادوں کا مالک ہے۔ وہ اول سے آخر تک بندۂ عمل نظر آتا ہے۔ مسلسل جدو جہد اور عمل ہی اسکی قد آوری کا باعث بنتی ہے۔ ڈر اور خوف کی وجہ سے بستی کے باقی لوگ بے عمل ہو جاتے ہیں۔ اور بزدلی انکے دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو صدا کیلئے لاغر اور محتاج بنا دیتا ہے۔ جس طرح مذکورہ نظم میں بستی کے باقی باسی غلامی اور بندگی کیلئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ نظم کا ہیرو چونکہ باعمل اور حوصلہ مند فرد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ تو صرف حاکم کا درجہ پاتا ہے بلکہ ایک عذاب سے عمر بھر کیلئے چھٹکارا بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اس عذاب کا نام شاعر کے نزدیک 'بزدلی' ہے۔ نظم کا آخری بند بطورِ خاص پیش ہے۔

'وہ ہنس کر بس اتنا بولا:
'لوگو'
گہرے نیلے پانی کا میں اگر یہ راز بتاتا
تم بھی میری طرح ہی لعل و گہر لے آتے
میرے حصے میں کیا آتا؟
تم جیسا ہو کر بھی میں تم سے کیسے قد آور بنتا؟
تم بھی دلاور ہو جاتے تو میری بات بھلا کیوں سنتے
تم میں کا ئرتا اب اپنا گھر کر بیٹھی
خوف تمہارے جسم و جاں کا اک حصہ ہے
بزدل ہونا ہی پہچان تمہاری ٹھہری

[1]...... حامدی کاشمیری۔ پیش لفظ۔ برفِ آفتاب، حکیم منظور) صفحہ ۸

مفلس ہونا اب تم لوگوں کا ورثہ ہے
میں اب تم سب کا راجا ہوں
ان داتا ہوں
تم بندے ہو'

(بزدلی ایک عذاب ہے) ص۔۱۱۴۔۱۱۳

حکیم منظور کی نظموں کے آئینے میں ان کی داخلی شخصیت کے خدوخال جھلکتے ہیں۔ یہ ایک حساس، دردمند، متلون مزاج اور بیدار دل انسان کی شخصیت ہے جو ذہنی طور پر فعال ہے اور جس کی فعالیت دانشورانہ بلندیوں کو چھوتی ہے۔ یہ گردو پیش کے سماجی تضادات اور سیاسی افراتفری سے پیدا شدہ صورتحال کا سامنا کر کے احساساتی طور پر غیر معمولی صدمے سے آشنا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کا شعری کردار مستقل مزاج ہونے کے علاوہ ذہنی استحکام بھی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو بکھرنے سے بچاتا ہے۔ نفسیاتی شعور کی بالیدگی اسکی انفرادیت کا تحفظ کرتی ہے۔ حکیم منظور کی نظموں کے شعری کردار کے بارے میں حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

'وہ (شعری کردار) مجسم سوال بن جاتا ہے۔ یہ سوال ایک کھرے وجود کا سوال ہے جس کی گونج قاری کے دل میں سنائی دیتی ہے۔ انسانی اقدار کا ساختہ و پرداختہ وجود، جو انسانیت، شرافت اور مروت کے صدیوں کے ورثے کا امین ہے، یہ اپنی دھرتی، فطرت اور ملک وملت سے وابستہ ہے اور اس سے بڑھ کر جو چیز اس کی انفرادیت کو جنم دیتی ہے وہ اس کی دانش مندی اور ہنر مندی ہے۔ جسکا شعور اس کی نفسیاتی زندگی پر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔'[1]

حکیم منظور کے یہاں حالات کی سنگینی کے زیر اثر امیدانہ رویئے کی شکست بھی ہوتی ہے ۔ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے حوالے سے لوگوں کی بے گانگی اور بے حسی کو دیکھ کر دل برداشتہ بھی ہو جاتے ہیں۔ 'رویہ' 'سارا سلسلہ علاماتی' 'مشورہ تیرا ہے کیا' اور 'شہر فسوں' اس کی مثالیں ہیں۔ لیکن شاعر یہاں اداسی اور محرومی کو اپنا شعار نہیں بناتا۔ وہ ایک زندہ انسان ہے ایک سچے محبّ وطن، آزادی اور عزت نفس کے موئید، حرکت وعمل کے داعی اور انسانی حرمت کی بحالی کا طلبگار ہے۔ یہ جذبہ آتشِ سیال بن کران کی رگ وپے میں سفر کرتا ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ انحراف اور احتجاج کی آواز بن جاتا ہے۔ چند مثالیں:

'ابھی کہاں فیصلہ ہوا ہے ابھی تو سودائے جاں ہے باقی
ابھی نہ تلوار ہاتھ سے تم رکھو کہ سچی دعاؤں کے آسماں ہیں باقی'

(یقین مانو۔ص۔۸۹)

'ہے یہ ممکن ترے اخلاص کے صدقے مری جاں
کوئی بھیجے گا پرندوں کی سپاہ۔'

(امید قعلہ۔امیدِ پناہ۔ص۔۸۶)

'یہ جاں لو اب صداقتیں صرف خنجروں پر لکھی ہوئی ہیں
لبوں پر آئیں تو بے اثر ہیں۔'

(ہجوم ہی ایک سچ ہے۔ص)

حکیم منظور کی نظموں کا جائزہ لیتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ کہیں کہیں وہ اپنی نظموں اور غزلیات کے مضامین اور خیال کو دہراتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی مثال نظموں کے مجموعے برفآفتاب میں شامل نظم 'ایقان' کے ایک مصرعے سے ملتی ہے۔ نظم کا مصرعہ یوں ہے:

ا۔۔۔۔۔حامدی کاشمیری۔ پیش لفظ۔ برفآفتاب حکیم منظور۔ص ۹

'تراشتا ہوں ان پتھروں سے بھی چہرے

جو مارتے ہیں میرے سر پہ میرے اپنے ہی'

(ایقان۔صفحہ ۴۷)

انکی غزل کا مندرجہ ذیل شعر اسی خیال وفکر کی غمازی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔یہ شعر انہوں نے نظموں کے مجموعہ 'پھول ، شفق آنگن کے' میں مرحوم عابد مناوری کی نذر بھی کیا ہے:

وہ تو فنکار ہے مارا ہے جو پتھر اُس پر

اُس نے اُس سے بھی کوئی چہرہ تراشا ہوگا

نظم 'ایقان' کے مصرعوں میں چہرہ تراشنے والا فنکار شاعر کی ذات ہے۔ یہاں صیغہ واحد حاضر متکلم ہے۔ جبکہ غزل کے شعر میں چہرہ تراشنے والے فنکار کیلئے صیغہ واحد غائب کا استعمال کیا گیا ہے۔

نظم ایقان میں شاعر نے اپنے مزاج اور شخصیت کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے کئی حقائق سے پردہ اٹھانے کی جو کوشش کی ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ نظم کے دو مصرعے ملاحظہ کیجئے:

مجھے یہ غرہ، میں اس سرزمین کا ہوں فنکار

میں اپنے مقصد و منصب سے گر نہیں سکتا

ایقان۔ص۔۴۷

مذکورہ نظم میں شاعر کا سنگ زار میں سبز تن پودے اگانے کے بعد بھی محنت کے ساتھ اگائے گئے گلابوں کا کاروبار نہ کر سکنے کی کمزوری دراصل شاعر کی شخصیت کا ایک ایسا عکس پیش کرتا ہے۔ جہاں وہ نیک خصائل کا مسجمہ دکھائی دیتا ہے جس نے دھوپ کی سختیاں جھیلتے ہوئے کبھی بھی ادھار کے سائے قبول نہ کیے۔ کئی دریاؤں کے دل لبھانے کے باوجود بھی اپنے ہونٹوں پر سلگتی پیاس کو سجائے رکھا۔

غرض شاعر نے کسی صورت بھی اَنا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ انہوں نے اونچی قدروں اور بلند اصولوں کا سر کبھی بھی جھکنے نہ دیا۔

حکیم منظور جذبے کی صداقت اور بے ساختگی کو تسلیم کرتے ہیں وہ کسی نظریئے یا مسلک کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دیتے۔ حکیم منظور لسانی طور پر بھی لفظ و پیکر کے برتاؤ میں مستعار رویوں پر انحصار نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کی زبان صاف شستہ اور ٹھوس ہے اس سلسلے میں کسی بھی نظم کو بطور نمونہ لیں تو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ حکیم منظور شخصی واردات یا عصری تجربات کو من و عن قاری تک پہنچاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی نظموں کا رنگ و آہنگ منفرد اور جداگانہ ہے۔

جہاں تک حکیم منظور نے صنفِ غزل اور نظم کو اپنا اظہارِ ذات و خیالات کا وسیلہ بنایا۔ وہیں پانچ صفحات پر مشتمل ایک طویل مثنوی بھی ان کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ مثنوی کل ۱۸۳ اشعار پر مبنی ہے۔ مثنوی کا عنوان 'ایک ادھوری مثنوی' ہے۔ اس مثنوی کے آخر میں ایک نوٹ تحریر ہے۔ جو اس طرح ہے:

'تنے اشعار کہنے کے بعد، کوششِ بسیار کے باوجود مثنوی آگے نہ بڑھ سکی۔'

۱۹۸۲ء[1]

حکیم منظور نہ صرف تاریخ پر گہری نگاہ رکھتے ہیں بلکہ تاریخ سے انہیں خاصی دلچسپی بھی ہے۔ وہ پختہ حافظہ کے مالک ہیں اسی نتیجہ کے طور پر انہوں نے یہ طویل تاریخی مثنوی رقم کرلی ہے۔ اس مثنوی میں واقعات کی روانی اسکی فطری اور فنی محاسن میں شامل ہے اور قاری جسکے تند بہاؤ میں کسی زور یا ہچکولے کے بغیر خود کو بہتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ مثنوی میں آورد کا خدشہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک لے کے ساتھ ایک کے بعد ایک واقعہ کسی کڑی کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ مثنوی چونکہ ادھوری ہے اور شاعر کی کوششوں کے باوجود بھی پوری نہ ہوسکی ہے۔ لہٰذا قاری کی نہ صرف تشفی نہیں

۱...... برفِ آفتاب۔ حکیم منظور۔ ص۔ ۱۲۴

ہوتی بلکہ اسکے ذہن میں کئی سوالات اور وسوسے بھی ابھرتے ہیں۔

حکیم منظور نے اس ادھوری مثنوی میں فنی لوازمات کو برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل عرصے پر محیط تاریخ کے اوراق کو الٹتے ہوئے مثنوی کو تاریخی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مثنوی کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

'نئی بات ہے کہنہ انداز ہے
یہ میری کہانی کا آغاز ہے
بزرگوں سے جو کچھ سنا ہے کہوں
جو خود میں نے دیکھا ہے وہ بھی لکھوں
میرا شہر تھا جیسے اک لالہ زار
ہوائیں یہاں کی تھیں خوشبو سوار
چمن میں عجب رنگ کے پھول تھے
جو موسم بھی تھے سارے معقول تھے

(ایک ادھوری مثنوی۔ص ۱۲۰)

حکیم منظور کی یہ مثنوی جہاں تہذیب و تمدن اور ثقافت کی آئینہ دار ہے وہیں آپسی بھائی چارہ، محبت اور اخوت کی منہ بولتی تصویر بھی ہے۔ مثنوی کے چند نمائندہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

'مزوں کے مرادوں کے دن رات تھے
گلابی ارادوں کے دن رات تھے
یہاں جنگلوں کی تھی اپنی ادا
یہاں کے پرندوں کی اپنی صدا

ترنم تھا جھرنوں کا فطرت کا ساز
یہاں جو بھی نالے تھے سب دلگداز
یہاں گھنٹیاں تھیں اذاں ہم نشیں
اخوت ، محبت کی یہ سرزمیں'

(ایک ادھوری مثنوی ص۔۱۲۱)

جہاں حکیم منظور نے اس مثنوی میں کشمیر کے قدرتی حسن اور فطرت کی نیرنگیوں کو نظم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے وہیں پھل، پھول، پیڑ، موسم، لباس اور مقامات کا ذکر کر کے اسے مقامی رنگ بھی عطا کیا ہے۔ اس مثنوی میں ایک صدی سے زیادہ عرصے کی تاریخ کا نقشہ کھینچنے میں شاعر نے پوری فنی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ مثنوی میں جن مقامات یا اشیاء کا تذکرہ ہوا ہے ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

'شالیمار، نشاط، نسیم باغ، پہلگام، اہرہ بل، گلمرگ، ہارون، ولر، ڈل ، بید، چنار، سفیدے، سیب، گلاس، آلوچہ، ناخ، ناشپاتی، شہتوت، وغیرہ۔'

خوبصورت ہونے کے باوجود بھی ان سب چیزوں کا حسن ماند پڑ گیا ہے کیونکہ غلامی نے سب کو پژمردہ کیا ہے۔ چند اشعار ایسے پیش کئے جا رہے ہیں جن میں شخصی راج کے وقت سماجی حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جب ریاستی عوام ظلم و بربریت کا شکار تھے۔ حکیم منظور تاریخ کے اس سیاہ باب کو زبان دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

'زمین ہی نہیں ہم بھی تھے ملکیت
مہاراج ایسے تھے والا صفت

مشقت ہماری، صلہ ان کا تھا
کوئی تھا اگر سلسلہ ان کا تھا
دوشالے بُنیں ہم پہنتے تھے وہ
عجب مستیوں کے ڈبوئے تھے وہ
تھے ہم تشنہ لب اور وہ شاد کام
ہمارا ہی پانی تھا ہم پر حرام
برہنہ تنی اپنی پہچان تھی
شکستہ نگاہی ہی عرفان تھی
ذرا لب کھلے اور کوڑے پڑے
ذرا سر اٹھا اور سر سے گئے
ذرا ہاتھ کھولے قلم ہوگئے
ذرا آنکھ اٹھائی کہ شعلے گرے

(ایک ادھوری مثنوی۔ صفحہ ۱۲۳)

حکیم منظور کی عصری آگہی کے بارے میں حامدی صاحب رقمطراز ہیں
"حکیم منظور کی ذہنی مشغولیت Preoccupation ترجیحاً معاصر حالات کے آشوب پر مرتکز رہی ہے۔ اور وہ دکھ، تردد، شکایت، اذیت، دل گرفتگی اور غم وغصے سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ ان کی چشمِ نگراں معاشرے کی ناہمواری اور سیاست کی چیرہ دستیوں پر ہے[1]"

موجودہ پرآشوب دور میں بھی حکیم منظور امید آفرینی اور خواب بینی کے رویئے کو برقرار رکھتے ہیں ۔ وہ جدید شعراء کی طرح کلبیت اور فریب شکستگی کو اپنا شعار نہیں

[1]...... حامدی کاشمیری۔ پیش لفظ۔ برفاَفتاب حکیم منظور۔ ص۔۱۱

بناتے۔ وہ جدیدیت کے ایسے رجحان کی نفی کرتے ہیں۔ ایسا رویہ ان کے ہاں رومانی میلان کو فروغ دیتا ہے۔ وہ اداس لمحوں سے گزرتے ضرور ہیں لیکن امید ویقین کی نفی نہیں کرتے۔ حکیم منظور کے رومانی رویہ کے سلسلے میں حامدی کاشمیری انگریزی کے مشہور شاعر شیلےؔ کی شاعری میں داخلی اور خارجی تصادم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

'یہ انکا (حکیم منظور) رومانی رویہ ہی ہے کہ جب خارج کی سنگلاخ حقیقتوں سے متصادم ہوکر ان کی آئینہ بینی کی شکست ہوتی ہے تو وہ شیلے کی طرح I fall upon the thorns of life i bleed کی صورت میں اپنے فوری ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ شیلےؔ ہی کی طرح ان کی خون گشتہ آرزوؤں کا احساس رومانی اداسی میں ڈھل جاتا ہے۔ جو جذباتی کیفیات کو مرتعش کرتا ہے۔[1]

حکیم منظور بنیادی طور پر بیدار مغز اور دردمند فنکار ہیں۔ ریاستی سطح پر لوگ جس پرآشوب دور سے گزرے ہیں بھلا حکیم منظور جیسا حساس دل رکھنے والا انسان ان حادثات پر کیونکر نہ خون کے آنسو بہاتا۔ بنیادی طور پر اگر دیکھا جائے تو حکیم منظور کی تمام تر نظمیں شہر آشوب کی روایت سے منسلک ہیں۔ اپنے مجموعہ نظم ''برفآفتاب'' میں انہوں نے ستائیس بندوں پر مشتمل ایک ''شہر آشوب'' بھی شامل کیا ہے۔ جو انیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر بند میں اشعار کی تعداد الگ الگ ہے۔ شہر آشوب میں ۱۹۸۰ء کا سن دیا گیا ہے جو اسکا سنِ تحریر ہے۔ اسکے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ کشمیر کا اور کشمیر کے حوالے سے حکیم منظور کا آشوب نامہ ہے۔ دراصل یہ آشوب نامہ ان کا اہم شعری کارنامہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں موجودہ انسان کے اخلاقی زوال کی روداد بیان کی گئی ہے۔

[1]......حامدی کاشمیری۔ پیش لفظ۔ برفآفتاب ص۔۹

شہر آشوب میں چونکہ کسی شہر کی پریشانی اور بربادی کا تذکرہ ہوتا ہے۔
حکیم منظور کے حصے میں وہ زمانہ آیا جب حالات نے پلٹا کھایا۔ صدیوں پرانی روایات واقدار مسمار ہوگئیں۔ خون بہا اتنا سستا ہوگیا کہ سارا شہر کربلا نظر آنے لگا۔ بڑے بڑے شعراء، ادباء، دانش وراور علماء وفضلاء کا اسی سرزمین سے خمیر اٹھایا جاچکا ہے۔ چوتھے بند میں انکا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے۔ حکیم منظور نے سماج کے ہر اس ٹھیکیدار کی طرف انگشت نمائی کی ہے جو شرافت کی نقاب پہنے ہوئے ہیں۔ ان کی نظر میں یہی لوگ مسمار ہوئی اقدار وروایات کے ذمہ دار ہیں۔ جہاں حکیم منظور نے شہر آشوب کے آغاز میں شہر کے عظیم تہذیبی ورثے کی شان کا ذکر کیا ہے وہیں مختلف اقوام اور مقتدر ہستیوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ جن کا مسکن یہ سرزمین رہی ہے۔ شاعر وقت کی تبدیلی پر نالاں بھی ہے اور پشیمان بھی۔ وہ شدت سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ جور وظلم اور کینہ پروری لوگوں کا شعار بن گیا ہے۔ انسانی حقوق کی پامالی کے دلدوز واقعات رونما ہونے پر بھی لوگوں کے دل نہیں پگھلتے۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی زبان پر پہرے بٹھائے گئے ہیں۔ نگاہوں کی مایوسی، زندگی کی پامالی، یقین کی بے اعتباری لوگوں کا مقدر بنتی جارہی ہے۔ گرد وپیش کے حالات وواقعات دیکھ کر شاعر توبہ کرنے لگتا ہے۔ چند اشعار بطور مثال ملاحظہ کیجئے:

خباثتوں کا عجب اعتبار ہے، توبہ
شرافتوں میں زدالت شمار ہے، توبہ!
شقاوتوں سے مزین ہیں علم کے ایوان
حماقتوں سے خرد ہمکنار ہے، توبہ!
رفاقتوں کے بہانے ہے دشمنی مقصد
صداقتوں سے ہر اک کو فرار ہے، توبہ!

عمارتوں سے ہے قد آدمی کا وابستہ

کثافتوں کا نظر پر غبار ہے، توبہ!

سلاستوں پہ عقوبت ہے سنگ ساری کی

فصاحتوں پہ ظلم کا حصار ہے، توبہ!

حکیم منظور نے کچھ ایسے جذبات وخیالات کو نئے لسانیاتی نظام میں ڈھال کر قاری کے سامنے ایماندارانہ طریقے سے نظم کی صورت میں پیش کیا ہے۔ بدلتے ہوئے دور میں ایک عام انسان بے بس اور لاچار نظر آتا ہے۔ وہ ظلم کی چکی میں برابر پستا چلا جا رہا ہے۔ حاکم ومحکوم کے درمیان ظلم کی زیادتیوں کی وجہ سے نفرت کا جذبہ پنپنے لگا ہے۔ جہاں مظلوم کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں وہاں ظالم کے ظلموں کی کوئی انتہا بھی نہیں ہے۔ منصف انصاف کرنے سے کتراتا ہے اور قاتل کے بجائے مقتول ہی کو قصوروار ٹھہرایا جا رہا ہے۔ ہر طرف قدروں کے ارتقاء پر جمود طاری ہے۔ حکیم منظور نے ۲۶ ویں بند میں فیض احمد فیض کی نظم ''وطن'' کا مصرعہ دہرایا ہے۔ شاعر اس مصرعے کے معنی کو سمجھانے والے کی تلاش میں ہے۔ مصرعہ یوں ہے:

'کہ سنگ قید ہیں کیوں اور سگ ہیں کیوں آزاد'

یہ فقط ایک مصرعہ یا خیال دہرایا نہیں گیا ہے بلکہ اس خیال کی آڑ میں تاریخ کو دہرایا گیا ہے۔ شاعر کے آشوب زدہ شہر میں بدنظمی اور بے انصافی اپنے عروج پر نظر آ رہی ہے۔ چند اشعار کی روشنی میں اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

کمال یہ نہیں مقتول پر ہے دعویٰ قتل

کمال یہ ہے کہ دعویٰ کی ہے پذیرائی

ملال یہ نہیں ہر حکم ہے ہمارے خلاف

ملال یہ ہے کہیں کیوں نہیں ہے شنوائی

سوال یہ نہیں گردن جھکائے ہیں ہم لوگ
سوال یہ ہے کہ جائز ہے کیوں جبیں سائی
خیال یہ نہیں ہم لوگ کیوں نہیں آزاد
خیال یہ کہ غلامی ہی راس کیوں آئی

ناگفتہ بہہ حالت کی بیان بازی کے باوجود شاعر امن و آشتی کیلئے کوشاں ہے۔ آشوب نامہ کے آخر میں علامہ اقبال کا شعر درج ہے۔ جو آرزوؤں اور امنگوں کو جگائے رکھنے کی تحریک بخشتا ہے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ایک یقین پر اس شہر آشوب کا خاتمہ ہوتا ہے جس میں سارے نظام میں از سر نو ایک تبدیلی کا یقین موجود ہے۔

حکیم منظور کی نثر نگاری

حکیم منظور یوں تو اردو شعر و ادب میں بحیثیت شاعر مانے جاتے ہیں اور شعر گوئی میں ان کا اپنا ایک منفرد مقام و مرتبہ ہے۔ دراصل ان کی شخصیت صحیح معنوں میں ان کی شاعری میں ہی نکھر کر سامنے آئی ہے۔ اردو شاعری کو نیا رنگ و آہنگ اور لب ولہجہ عطا کرنے میں حکیم منظور کا نام بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔

شاعری سے قطع نظر حکیم منظور نے نثر میں اپنی بھرپور صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ اردو نثر کے حوالے سے حکیم منظور کا کام زیادہ طویل نہیں ہے۔ انہوں نے 'اقبال ایک تذکرہ' کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کتاب کے علاوہ انکی نثری تخلیقات میں کئی تبصرے اور تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ حکیم منظور نے اخبار 'خبر و نظر' جاری کر کے نثری ادب کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ حالانکہ انکا خیال ہے 'اردو زبان میں نثر لکھنا سب سے مشکل کام ہے'۔

''اقبال ایک تذکرہ'' میں حکیم منظور کی نثری اظہاریت اپنے پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے اقبال سے انکی گہری وابستگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال کے فکر و فن پر آج تک سینکڑوں کتابیں اور مقالے معرض وجود میں آچکے ہیں اور اپنی اپنی بساط کے مطابق سبھی حضرات نے اقبال کے فکر و فن کے متعدد پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اقبال کے افکار و نظریات بحرِ بیکراں ہے۔ جس کی تہہ میں لاکھوں موجیں موجزن ہیں۔ ماہرین اقبال نے ان کے شعری حسن اور فنی تنوع اور تخلیقیت سے زیادہ ان کے فکری پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'اقبال ایک تذکرہ' میں حکیم منظور نے مانوگراف کی شکل میں علامہ اقبال کا مختصر مگر انتہائی جامع

تذکرہ پیش کیا ہے۔ اردو میں مانوگراف کی روایت کے اعتبار سے حکیم منظور کی یہ سعی ایک قابل قدر اور اہم کارنامہ ہے۔ اس میں علامہ اقبال سے متعلق ضروری معلومات نہایت ہی مدلل اور سادہ انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ماہرین اقبالیات کی رائے میں اقبال کو عوامی دلچسپی کا موضوع بنانے کی از حد ضرورت ہے۔ اس کتاب کی تحریر واشاعت کے پس پردہ وجوہات کے بارے میں نحوی صاحب لکھتے ہیں

'اقبال کے افکار ونظریات کو ماہرین اقبالیات نے اعلیٰ ادبی اور فنی تناظر میں پیش کرنے کی قابلِ قدر مساعی کی ہیں لیکن اقبال کے فکر، پیغام اور روح کو عوام کے دلوں میں منتقل کرنے کی کوئی ایسی باضابطہ کوشش نہیں ہوئی ہے جس سے فکرِ اقبال عوامی دلچسپی کا معروف اور پسندیدہ موضوع بن جاتا۔ ہم نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اقبالیاتی ادب کے چند ماہرین اور معتبر تحقیق کاروں سے رابطہ کر کے اقبال کے افکار ونظریات پر مانوگراف لکھوانے کا منصوبہ بنایا ہے۔'[1]

حکیم منظور چونکہ اقبال کے تئیں نہایت عقیدت ومحبت رکھتے ہیں لہٰذا پہلا مانوگراف انہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ جس میں انہوں نے اقبال شناس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک معتبر نثر نگار ہونے کی سند بھی حاصل کر لی۔ بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں:

'حکیم صاحب کو ماہر اقبالیات ہونے کا دعویٰ نہیں ہے لیکن جس اخلاص نیت کے ساتھ انہوں نے اقبال فہمی اور اقبال شناسی کا حق ادا کیا ہے وہ قابل صد تحسین وآفرین ہے۔'[2]

حکیم منظور کی نثر نویسی کا اپنا الگ انداز ہے وہ جہاں شاعری میں منفرد اسلوب کے مالک ہیں وہیں سلیس، رواں اور شگفتہ نثر لکھنے میں بھی انہیں کمال حاصل ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس اس سلسلے میں بطور مثال پیش کیا جا رہا ہے:

۱،۲...... ڈاکٹر بشیر احمد نحوی۔ پیش گفتار۔ اقبال ایک تذکرہ۔ حکیم منظور

'ہیرا چاہے کسی حالت میں ہو، ہیرا ہی رہتا ہے اور بیش قیمت ہوتا ہے۔ ہیرے کو ڈھنگ سے تراشنے اور پرکھنے والا ملے تو اس کی حیثیت اور قیمت میں کئی گنا اضافہ ہونا لازمی ہے۔ اقبال بھی ایک ہیرا ہی تھے جسے پرکھنے اور تراشنے والوں میں اپنے زمانے کے نابغہ شامل تھے۔ ان کے مکتب کے استاد مولوی غلام حسین تھے۔ مکتب سے نکلے تو مولوی میر حسن کے سامنے زانوے ادب تہہ کر جو ایک بار بیٹھے تو پوری عمر ذہنی طور پر زانوئے ادب تہہ کئے بیٹھے ہی رہے۔ میر حسن، فارسی، عربی، اردو، اسلامیات، ادبیات، لسانیات، ریاضیات اور تفسیر کے لامثال عالم تھے۔ وہ روشن خیال، وسیع المشربی اور کشادہ ذہنی کی چلتی پھرتی علامت تھے۔ اسی لئے انہیں اقبال کا 'مجمع البحرین استاذ' کہا جاتا تھا۔ اسی مجمع البحرین استاد نے اقبال کو ایسا مجمع الکمالات شاعر، فلسفی، مفکر اور مدبر بنایا کہ ان کو شہرت عام اور بقائے دوام کی دولتِ بیدار حاصل ہوگئی۔'[۱]

'اقبال ایک تذکرہ' یہ کتاب حکیم منظور نے اقبال انسٹی چیوٹ کشمیر یونیورسٹی کیلئے تحریر کی ہے۔ یہ کتاب ۱۱۳ صفحات پر مشتمل ہے اور مارچ ۲۰۰۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ یہ کتاب سترہ ابواب پر محیط ہے۔ "اقبال ایک تذکرہ" شاعر مشرق کے شخصی و نجی حالات و واقعات مغرب کے اثرات، اسلامی نظریات، انسان دوستی، خودی و بے خودی کے اسرار و معارف قرآن و سنت اور چند دیگر عنوانات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ کتاب نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب پر حکیم منظور اپنی رائے زنی کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

'اس اجمالی تذکرے کے عنوانات پر لکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ

[۱]...... حکیم منظور۔ اقبال ایک تذکرہ۔ ص ۶

حیات اقبال اور کلام اقبال کے کئی گوشوں پر ابھی کماحقہ تحقیق وتبصرہ نہیں ہوا ہے۔ اس تذکرے کی ضخامت اس بارے میں کھل کر کہنے میں مانع رہی ۔ میں نے کہیں واضح اور کہیں بین السطور کچھ اعتراضات اور مفروضات کا جواب فراہم کیا ہے اور کچھ سوالات کو سوال ہی رہنے دیا تا کہ تحریک وتشویق کا باب کھلا ہی رہے۔[1]

حکیم منظور نے موضوعات کے انتخاب اور جائزے کے حوالے سے بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے اور ساتھ ہی علامہ اقبال کی شخصیت نیز تخلیقی رو کا بھی احاطہ کیا ہے۔ پہلے باب میں انہوں نے شخصی اجمال کے حوالے سے علامہ اقبال کی زندگی کے چند اہم واقعات قلم بند کیے ہیں۔ خصوصاً کشمیر سے ہجرت اور سیالکوٹ میں سکونت کا ذکر اور ساتھ ہی ساتھ ان کے آبا واجداد کا تذکرہ بھی شاملِ حال ہے۔ اقبال کے جدِ اعلیٰ کشمیری براہمن تھے اور ذات کے سپرو۔ اس خاندان کے کسی ایک بزرگ نے اسلام قبول کر کے کشمیر سے سیالکوٹ ہجرت کی اور وہیں ان کی نسل سے شیخ رفیق پیدا ہوئے جو اقبال کے دادا تھے۔ انہی شیخ رفیق کے فرزند شیخ نور محمد علامہ اقبال کے والد تھے۔ حکیم منظور نے شیخ نور محمد کی پاکیزہ سیرت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اقبال کے والد اگر ظاہری علوم سے کماحقہ واقفیت نہ رکھتے تھے تاہم باطنی علوم میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ اس باب میں مصنف نے علامہ کی تاریخ پیدائش سے متعلق مختلف سنین کا تذکرہ کیا ہے۔ چونکہ محققینِ اقبال نے وقتاً فوقتاً ان کی تاریخ پیدائش کو بھی موضوع بنایا ہے۔ تاہم جدید تحقیق کے مطابق علامہ کی تاریخ پیدائش ۹ رنومبر ۱۸۷۷ء درست قرار دی جاتی ہے۔ اس ضمن میں حکیم منظور لکھتے ہیں:

[1]..... حکیم منظور۔ گزارش احوال واقعی ص۔۱

''بہت تحقیق و تجسس اور بحث و مباحثہ کے بعد اب ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء کی تاریخ و سنِ ولادت پر اتفاق رائے ہو گیا ہے۔''[1]

مصنف کا یہ امتیاز ہے کہ انہوں نے تمام تواریخ اور سنین کو یکجا کر دیا ہے جو اکثر ماہرین اقبال کے خیال میں علامہ کی تاریخِ پیدائش قرار دی گئی ہے۔ حالانکہ جدید تحقیق نے ان تمام سنین کو غلط ثابت کر دیا ہے اور مصنف نے استدلال اور براہین کیساتھ سن و تاریخ پیدائش صحیح ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس باب میں انہوں نے اقبال کی ابتدائی تعلیم اور دیگر امور سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ خصوصاً اساتذہ اقبال جنہوں نے اقبال کی شخصیت پر گراں قدر اثرات مرتب کئے ہیں۔ مولانا سید میر حسن اور پروفیسر آرنلڈ ان دونوں نے اقبال کو صاحبِ اقبال بننے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

دوسرے باب میں نجی کوائف کے تحت علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اقبال کی ازدواجی زندگی کو لیکر اکثر ماہرین انگشت نمائی کرتے ہیں اور یہ بات قدرے درست بھی ہے کہ علامہ کی ازدواجی زندگی کسی حد تک ناخوشگوار رہی ہے لیکن اس سلسلے میں حکیم منظور نے یہ جواز پیش کیا ہے کہ اس سے اقبال کے مقام و مرتبے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اتنا ضرور ہے کہ ذہنی آسودگی اور اطمینان و سکون تخلیقی عمل کی بنیادی ضرورتیں ہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

'اقبال کے نکتہ چیں اس بات پر سخت برہم ہیں کہ اقبال نے کریم بی بی کو طلاق کیوں دی اور بعد ازاں اپنی وصیت میں اسے اور آفتاب احمد کے نام کیوں جائیداد میں سے ایک ہبہ تک مخصوص نہیں کیا۔ اس اعتراض کے جواب میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اولاً اقبال کی شاعرانہ شخصیت اور مفکرانہ مرتبے کے تعین میں یہ دو واقعات

[1]...... حکیم منظور۔ اقبال ایک تذکرہ۔ ص ۱

کوئی اہمیت نہیں رکھتے......اس طلاق کی وجہ بداہتہً ذاتی اور شخصی رہی ہوگی۔ اگر کریم بی بی کا زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونا کوئی وجہ ہوتی اور اقبال نے سوچا ہوتا کہ وہ ایسی بیوی کو لیکر کیسے سماجی تقاریب میں شرکت کرسکیں تو اس کی نفی اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے جب جنوبی افریقہ میں اقبال کو ایک منصب کی پیش کش کی اور شرط یہ رکھی کہ وہ (اقبال) اپنی بیوی کا پردہ نہ کرائیں تو اقبال نے یہ آفر یہ کہہ کر رد کردی کہ وہ ایک معمولی عہدے کیلئے شریعت محمدیؐ سے منہ نہیں موڑ سکتے۔[1]

اس مذکورہ بالا اقتباس سے حکیم منظور کی حقیقت پسندی اور منطقی اندازِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اس باب میں علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی کو توازن کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ علامہ اقبال کی دوسری شادی دراصل نزاع کا شکار ہوگئی تھی۔ چونکہ چند مفاد پرستوں نے یہ افواہ پھیلادی تھی کہ اقبال کی ہونے والی بیوی کا کردار مشکوک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے بغیر تحقیق کے لدھیانہ کے متمول خاندان میں شادی کرلی۔ لیکن بعد ازاں چند حاسدوں کی جانب سے پھیلائی گئی افواہ غلط ثابت ہوئی تو انہوں نے کشمیری خاندان کی لڑکی سے پھر رجوع کرکے رشتہ جوڑلیا۔

اس باب میں مصنف نے اقبال کی قناعت پسند فطرت کو نہایت ہی عمدگی سے موضوع بنایا ہے۔ اقبال کی زندگی فقر و استغنا کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے نانِ دستِ دگرے سے پناہ چاہی ہے۔ اس ضمن میں حکیم منظور نے ایک واقعہ درج کیا ہے کہ جب نواب آف بھوپال نے اقبال کو کچھ رقم ارسال کی تو اقبال نے بڑے ادب کے

[1]......حکیم منظور۔ اقبال ایک تذکرہ۔ ص ۷

ساتھ نواب صاحب کو واپس کر دی۔ ایک خط کے حوالے سے منظور صاحب نے اس واقعہ کو واضح کیا ہے۔ یہ خط علامہ اقبال نے سر راس مسعود کو ۱۱ر ستمبر ۱۹۳۵ء کو لکھا:

'اعلیٰ حضرات نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لئے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لئے کافی ہے۔ اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے۔ جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں'۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال فاروق اعظمؓ کی زندگی کو اصل نمونہ بنائے ہوئے تھے۔ علامہ اقبال اکلِ حلال کے پیکر تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نوابوں اور سلطانوں کی طرح عیش و عشرت کو زندگی کا شعار بنایا جائے۔ جو اسلامی روح کے منافی ہے۔ حکیم منظور نے علامہ کی قناعت پسندی اور فقر و استغنا کو انہی کے اس قطعہ سے بھی واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو علامہ نے سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدر آباد کو ایک ہزار روپے کے چیک کے سلسلے میں ارسال خدمت کیا تھا۔

تھا یہ فرمانِ الٰہی شکوہ پرویز | دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر | حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول | جب کہا اس نے یہ ہے مری خدائی کی زکات

اس کے علاوہ بھی علامہ اقبال کو وظائف کی پیشکش ہوتی رہی مگر انہوں نے اکثر و بیشتر وظائف قبولنے سے انکار کر دیا۔ حکیم منظور نے اس ضمن میں تمام حضرات کے وظائف کا ذکر کیا ہے۔ اس باب میں فاضل مصنف نے اقبال کی طرزِ زندگی کو بھی موضوع بنایا ہے کہ ان کی زندگی تصنع و تکلف سے یکسر عاری تھی۔ ان کا انداز درویشانہ اور فقیرانہ تھا۔ وہ انتہائی درجے کے خود دار اور اسلامی زندگی کے متمن

تھے۔وہ انگریزی لباس صرف عدالت یا کالج میں زیب تن فرماتے۔اس باب میں مصنف نے اقبال کی اپنے عزیز و اقربا کے تئیں دیرپا محبت کا بھی ذکر کیا ہے۔والدۂ اقبال کی محبت کو بھی موضوع بنایا ہے جو کہ اقبال کی نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' سے مترشح ہوتی ہے۔

تیسرے باب میں فاضل مصنف نے اقبال کے 'تخلیقی منظرنامہ......نثر' کے حوالے سے علامہ کی نثر سے بحث کی ہے اور اقبال کے نثری سرمایئے سے متعلق بڑی جامع نپی تلی رائے پیش کی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کا شعری سرمایہ اتنا وسیع ہے کہ ماہرینِ فن نے عقیدت کے پھول نچھاور کئے ہیں لیکن ان کا نثری سرمایہ اگرچہ قلیل ہے تاہم اپنے تخلیقی حسن اور ترسیلیت کے عمل سے بھرپور ہے۔

اقبال کے نثری سرمائے میں 'علم الاقتصاد' اور 'تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' دو کتابیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔علم الاقتصاد بزبان اردو ہے جبکہ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ The reconstruction of religious thought in Islam بزبان انگریزی ہے۔علم الاقتصاد معاشیات سے متعلق علامہ کی اہم کتاب ہے اور اردو میں بھی شاید یہ پہلی کتاب ہے جو اس خشک موضوع پر کسی ماہر کی فاضلانہ تصنیف ہے۔ 'تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam علامہ کا اسلامی افکار و نظریات اور بدلتے ہوئے دور میں اسلامی فکر کی معنویت کے سلسلے میں اہم کارنامہ ہے۔اس باب میں علامہ کے تخلیقی منظرنامے پر پُر مغز بحث کی گئی ہے اور اقبال کے خطوط کے حوالے سے انکی نثر پر سیر حاصل بحث بھی کی گئی ہے۔حکیم منظور نے اس سلسلے میں عام فہم اور سادہ زبان کا استعمال کیا ہے۔درج ذیل اقتباس اس سلسلے میں بطور مثال پیش ہے ملاحظہ کیجئے:

'یہ عجیب بات ہے کہ ہر چند شاعری کیلئے کچھ قواعد و ضوابط مقرر کئے

گئے ہیں جن کی پابندی سے کسی صورت میں مفر نہیں۔ نثر لکھنے میں ہر شخص آزاد ہے اور اپنی سی نثر لکھ سکتا ہے۔ شاعری کیلئے شعری زبان مخصوص ہے اور نظم و غزل میں ذرا سے تفاوت کے ساتھ ایک جیسی ہے۔ نثر کی زبان اصولاً مضمون کے اعتبار سے مختلف ہونی چاہئے تاکہ مضمون اور موضوع کا حق ادا ہو۔ صحافت کی زبان یقیناً شعری مجموعوں کی شرح کی زبان سے مختلف ہونی چاہئے۔ اقتصاد پر مضمون کی زبان وہ نہیں ہو سکتی جو زبان کسی مذہبی موضوع پر لکھتے ہوئے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ تنقید کی زبان جغرافیائی مضامین کے بیان کا حق ادا نہیں کر سکتی بلکہ اجنبی سی معلوم ہوگی۔ تاریخ کی زبان کا علمی کے بجائے روزمرہ کی زبان ہونا اہم ہے تاکہ تاریخ عام عوام تک پہنچے۔ ہمارے ہاں نثر میں کوئی تخصیص نہیں۔ ہر آدمی ہر قسم کی نثر لکھنے پر خود کو قادر سمجھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اردو میں اس سادہ نثر کا فروغ ہی نہیں ہوا ہے، جو شعر سے الگ آہنگ و ادا کی حامل ہوتی ہمارے اکثر نثر نگار صنعت تجنیس اور شاعرانہ آہنگ سے کام لیتے ہیں اور ایسی نثر لکھتے ہیں کہ بسا شعر کا گماں گزرتا ہے۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے حکیم منظور کے تنقیدی شعور کی غمازی ہوتی ہے۔ وہ مضامین کی ادائیگی میں زبان کے استعمال سے پوری طرح باخبر ہیں۔ انہوں نے اخبار 'خبر و نظر' کے اداریئے لکھے یا تبصرے یا پھر دیباچے۔ ان تمام ضوابط کو عملی طور پر کامیابی کے ساتھ برتا بھی ہے۔ اقبال کی نثر کا جائزہ لیتے ہوئے وہ علامہ کی نثر کو یکسر جداگانہ پاتے ہیں اور انہیں صاحب اسلوب نثر نگار قرار دیتے ہیں۔

۱...... حکیم منظور۔ اقبال ایک تذکرہ۔ ص ۱۶

چوتھے باب میں فاضل مصنف نے اقبال کی شاعری کے تخلیقی منظرنامے کو موضوع بنایا ہے۔ یہ بات انتہائی اہم ہے کہ اقبال کا تخلیقی منظرنامہ ان کی تخلیقی قوت کا سرچشمہ ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ انہوں نے اپنی غزلیات اور نظموں کیلئے نیا آہنگ دریافت کیا ہے۔ حکیم منظور نے یہ صحیح لکھا ہے کہ اقبال کی غزلوں کی لفظیات غزل کیلئے نامانوس تھی ۔ چونکہ غالب ایسے بڑے فنکار کے ہاں بھی غزل کا نیا آہنگ اس طرح سامنے نہیں آتا جس طرح کہ اقبال کے ہاں ہے۔ مصنف نے اقبال کی شاعری کا آغاز سے اپنی رائے کا اظہار منطق اور استدلال کے ساتھ کیا ہے۔ حکیم منظور نے جہاں غزل کے حوالے سے علامہ کی تخلیقی قوت کو بروئے کار لایا ہے وہیں نظم نگاری کے حوالے سے بھی انہوں نے علامہ اقبال کی نظموں کا بہترین تجزیہ کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال کے سارے شعری سرمایئے میں غزلیات کی تعداد کل ملا کر ۱۲۹ بنتی ہے۔ لیکن یہ فن کی پختگی اور نامانوس آہنگ ولب ولہجہ کے اعتبار سے اردو ادب کا سرمایہ افتخار ہے۔ انہوں نے غزل کو بھی پیغام رسانی کا ذریعہ بنایا اور اپنے فکر و فلسفے کو عوام تک پہنچایا۔ حکیم منظور اقبال کو ترکیب ساز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> 'تراکیب کے استعمال سے اردو شاعری ناواقف تھی ۔ اقبال نے تراکیب سازی کو فن کا درجہ دیا۔ جس نے جدید شاعروں کو فن کی اس سمت میں قدم رکھنے کا حوصلہ دے دیا۔ ہر غزل میں ایک یا ایک سے زیادہ ایسی ترکیبیں سامنے آتی ہیں کہ قاری ان کی تازگی اور شعری حسن کے سحر میں کھو جاتا ہے'[۱]

حکیم منظور نے علامہ کے مبسوط علامتی نظام کا تذکرہ بھی کیا ہے جو انکی غزل کا خاصا ہے۔ مصنف کا ماننا ہے کہ علامہ اقبال نے ہی علامتی اسلوب کو متعارف کیا اور اعتبار بخشا۔

۱..... حکیم منظور۔ اقبال ایک تذکرہ ص۔ ۳۲

پانچویں باب میں نظم کے حوالے سے اقبال کے تخلیقی منظرنامے پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جہاں تک اقبال کی نظم نگاری کا تعلق ہے انہوں نے نظم کی روایت سے دونوں سطحوں پر انحراف کیا ہے۔ موضوع اور فن کے سلسلے میں اقبال کے ہاں جو تنوع ملتا ہے وہ اردو کی روایتی نظم نگاری میں ناپید ہے۔ اقبال نے موضوعاتی سطح پر بھی تجربات کی گونا گونی کا مظاہرہ کیا ہے اور اس صنف کو پیغام رسانی کا ذریعہ بنایا ہے۔ ساتھ ہی فلسفیانہ موشگافیوں سے بھی روشناس کیا ہے۔ اردو میں علامہ حالی نے شاعری کو سماجی اور تاریخی حقائق سے روشناس کیا ہے۔ خاص کر مسدس لکھ کر انہوں نے مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان کو پیش کر کے مسلمانوں کے اندر ہمت اور اعلا کردار پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

علامہ اقبال نے ایک جانب سرسید تحریک سے استفادہ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ علامہ حالی کے اسلامی، اخلاقی، سماجی اور تاریخی شعور سے بھی فیض اٹھایا ہے۔ جس سے ان کی شاعری میں فنی تنوع پیدا ہوتا گیا۔ حکیم منظور نے ان کے تخلیقی عمل پر منطقی انداز میں بحث کی ہے۔

چھٹے باب میں فاضل مصنف نے فارسی شاعری کے حوالے سے علامہ کے تخلیقی منظرنامے پر روشنی ڈالی ہے۔ علامہ اقبال حقیقت میں نابغہ روزگار تھے جنہوں نے اردو انگریزی اور فارسی زبانوں کو اپنی پیغام رسانی کا ذریعہ بنایا۔ فارسی مسلم دنیا کی ایک طویل عرصے تک دفتری زبان رہی اور آج بھی ایک بڑی مسلم آبادی فارسی بولتی اور سمجھتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ اقبال نے اسلامی افکار کے گہرے نکات کو فارسی زبان ہی میں پیش کیا ہے۔ چونکہ اقبال کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ بدلتے ہوئے دور میں اسلامی افکار کی جس تشکیل جدید کی ضرورت ہے شاید اس کو اہل اردو برداشت نہ کرسکیں۔ اسی لئے انہوں نے فارسی کو ذریعۂ اظہار بنایا۔

علامہ اقبال کے تخلیقی عمل پر بحث کرتے ہوئے فاضل مصنف نے صحیح لکھا ہے:

'......کیونکہ اقبال نے فارسی شاعری کو اپنے فکر و فلسفہ سے ایک نئے طرز ادا نئے ڈکشن اور اظہار کی نئی سطح سے آگاہ کیا جس کا زندہ و پائندہ ثبوت جاوید نامہ ہے۔'[1]

ساتویں باب میں حکیم منظور نے 'اقبال بچوں کی دنیا میں' کے حوالے سے علامہ اقبال کے شعری سرمایئے کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں بچوں سے متعلق شعری تخلیقات پر بحث کی گئی ہے۔ علامہ اقبال چونکہ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، عالی ہمتی اور حوصلگی نیز دوسری عاداتِ صالحہ پر زور دیتے ہیں۔ انہوں نے بچوں کیلئے متعدد ایسی نظمیں تخلیق کی ہیں جن میں بچوں سے متعلق کوئی نہ کوئی درس پوشیدہ ہے۔ فاضل مصنف نے ان تمام امور کو زیر بحث لایا ہے جو مذکورہ موضوع سے متعلق ہیں۔ یہ حکیم منظور کے طرزِ بیان کی خوبی ہے کہ انہوں نے نہایت ہی عام فہم انداز میں متذکرہ موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

آٹھویں باب میں شاعرِ آفاق کے عنوان سے علامہ کے آفاقی قد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اقبال زندگی کے تمام امور سے متعلق جس گہرائی اور گیرائی سے سوچتے ہیں اور جو افکار و خیالات نیز نظریات جس تنوع اور ہمہ گیری کے ساتھ پیش کرتے ہیں عالمی سطح پر اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ اقبال ایسا مفکرِ زماں اور یکتائے روزگار اگر یورپ میں پیدا ہوتا تو قوم تاقیامت اس بحرِ بیکراں کے حضور عقیدت کے پھول نچھاور کرتی۔ لیکن افسوس کہ علامہ اس ملک میں پیدا ہوئے جہاں علم و فن، فکر و فلسفہ نیز تخلیق عوامل کا شعور بہت کم لوگ رکھتے ہیں۔

حکیم منظور نے علامہ کو شاعرِ آفاق کے روپ میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

[1]..... حکیم منظور۔ اقبال ایک تذکرہ ص۔ ۴۱

'وہ (اقبال) صرف حکیم الامت اور شاعرِ مشرق نہیں تھے بلکہ ان کی فکر، اس فکر کی جہتیں اور اس فکر کے رنگ آفاقی تھے۔'

اقبال پر بین الاسلامی نظریہ کی حمایت کے حوالے سے جو لوگ اعتراض کرتے ہیں حکیم منظور نے ان اعتراضات کا جواب علامہ کے اشعار کے ذریعے ہی دیئے ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ جمعیتِ اسلامی ہی جمعیتِ آدم کیلئے راہ ہموار کر سکتی ہے۔ کیونکہ اسلام کا مقصود جمعیتِ اقوام سے کہیں زیادہ جمعیتِ آدم ہے۔ اس سلسلے میں یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

مکہ نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

حکیم منظور کا ماننا ہے کہ اقبال کا پیغام کسی ایک قوم کیلئے نہیں ہے بلکہ خودی کا درس ہر اُس قوم کیلئے ہے جس کے قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں۔ اور جو غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہونے کی متمنی ہو۔ اقبال نوجوانوں کو خودی میں تکمیل کے خواب دیکھتے ہیں۔ فاضل مصنف نے شاعر آفاق علامہ اقبال کی ان خصوصیات کا ذکر کیا ہے جو ان کا خاصا ہیں۔

نویں باب میں حکیم منظور نے 'بارگاہ عشق رسولؐ میں' کے عنوان سے اقبال کے عشق رسولؐ کا تذکرہ کیا ہے۔ اقبال نے اپنے تمام شعری اثاثے میں عشق رسولؐ کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ وہ عشق رسولؐ کو مسلمانوں کی کامیابی کی اصل قرار دیتے ہیں۔ اقبال کا یہ شعر ؎

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

اور پھر یہ کہ ؎

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

حکیم منظور نے موقعہ ومحل کے مطابق علامہ کے اشعار کو بطور حوالہ پیش کیا ہے۔
اسی باب میں عشق رسولؐ کے حوالے سے انہوں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علامہ آقائے دوجہاںؐ سے کتنی عقیدت رکھتے تھے۔

'علامہ کو رسول اللہؐ کی ذات سے اتنی محبت اور عقیدت تھی کہ حضورؐ کی زندگی کا کوئی واقعہ انہیں سنایا جاتا تو وہ رو پڑتے تھے'[1]

حکیم منظور نے متعدد واقعات اور اشعار پیش کئے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عشق نبیؐ علامہ کے دل میں گھر کر چکا تھا۔ اس باب میں جہاں اقبال کے دل میں حضور کیلئے عقیدت ومحبت کے جذبے کی عکاسی ملتی ہے وہیں حکیم منظور کی اسلام اور قرآن وسنت سے گہری واقفیت کے ثبوت بھی میسر آتے ہیں۔ چونکہ حکیم منظور اسلامی رموز ونکات پر گہری نظر رکھتے ہیں اسی لئے قرآن وسنت کی روشنی میں کلام اقبال کا جائزہ پیش کرنے میں ان کی ذاتی دلچسپی بھی شامل ہے۔ اس سلسلے میں حکیم منظور نے کلامِ اقبال سے جتنے بھی شعری نمونے پیش کئے ہیں وہ برمحل اور حسبِ حال ہیں۔

دسویں باب میں فاضل مصنف نے 'سطح بینی وجہہ خلط مبحث' کے عنوان سے علامہ اقبال کے نکتہ چینوں کی جانب سے لگائے گئے ان الزامات اور خدشات کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل جو لوگ علامہ کے چند ایک تصورات سے چیں بہ چیں ہوتے ہیں وہ حقیقت حال سے آگاہ نہیں ہیں۔ فاضل مصنف نے جن نکات کو واضح کر کے ان الزامات کی نشاندہی کی ہے جو سطح بینوں کے نزدیک قابل اعتراض ہیں۔ حکیم منظور مضمون کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"اکثر غیر مسلم علامہ اقبال کے کلام میں کافر، مومن اور شاہین ان تینوں لفظوں سے بدکتے ہیں وہ کافر کو صرف ہندو اور مومن کو غیر مسلموں

---

[1]...... حکیم منظور۔ اقبال ایک تذکرہ۔ ص ۶۵

کے خلاف برسرِ پیکار رہنے والا شخص سمجھتے ہیں۔ کچھ مسلمان بھی ان دو لفظوں کے یہی معنی لیتے ہیں۔ شاہین کو خونخواری اور کشت وخون کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ انہی تین الفاظ کے استعمال کے سبب مسلمانوں نے اقبال کو حکیم الامت بنایا اور غیر مسلموں نے اس کشادہ نظر اور وسیع القلب مفکر شاعر پر تنگ نظر اور متعصب ہونے کا لیبل لگایا......[1]

حکیم منظور نے ان مذکورہ بالا الزامات کی تردید کے سلسلے میں مدلل رائے زنی کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ علامہ چونکہ وسیع المطالعہ اور علم کے بحرِ ذخار تھے اسی لئے انہوں نے ان اصطلاحوں کے معنوں کو وسیع تر تناظر میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ کافر کی اصطلاح اقبال کے نزدیک بڑی وسیع ہے۔ خاص کر سنگ دل اور ناشکری کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ حکیم منظور علامہ کے تصورات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اقبال کا مردِ مومن وہ مردِ کامل ہے جو اعلیٰ پاکیزہ کردار اور بے مثال سیرت اور اخلاق کا مالک ہوتا ہے۔ یہ مومن زمین پر اللہ کا نائب یا خلیفہ اللہ علی الارض ہے اور بنی نوع انسان کیلئے سراپا رحمت۔ جس کا ہتھیار عشق ہے۔ اقبال کے کلام میں شاہین کے تصور کو حکیم منظور نے کشمکشِ حیات کا اشاریہ قرار دیا ہے۔ جو انسان کو ہمیشہ مائل بہ عمل و حرکت رکھتا ہے۔ مصنف نے منطق اور استدلال کے ساتھ اس غلط فہمی کو دور کیا ہے جو اکثر و بیشتر عوام الناس میں پایا جاتا ہے۔ حکیم منظور نے اس تاثر کو غلط ثابت کیا ہے کہ اقبال کا فلسفہ جارحیت سکھاتا ہے۔

گیارھواں باب جو پاسبانِ خودی کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے میں اقبال کے فلسفۂ خودی پر مفکرانہ بحث کرتے ہوئے حکیم منظور نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ

[1]......حکیم منظور۔ اقبال ایک تذکرہ۔ ص ۱۷

خودی کا لفظ اقبال کے فکری نظام کی کلید ہے اور ایک علامت کا درجہ رکھتا ہے۔ اقبال کے یہاں خودی وسیع الابعاد ہے۔ وہ خودی کی تعریف وتوصیف بہت ہی عمدگی سے کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال کے نزدیک وہی امتیں رسوا ہو جاتی ہیں اور وہی ادب بے کیف اور بے معنی ہوتا ہے جو خودی کا حامل نہ ہو۔ خودی ہی امتوں کو سلطنتیں عطا کرتا ہے اور خودی سے مملو ادب ہی ذہن وجسم کی تربیت کا حق ادا کرسکتا ہے۔ اس باب کے آخر میں مصنف اقبال کے فلسفۂ خودی کو اصل حیات اور مقصدِ تخلیق انسان اور فلسفہ نیابت کی شارح قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے تصور خودی کو واضح کرنے کیلئے کلام اقبال کے جو چیدہ نمونے پیش کئے گئے ہیں ان کے انتخاب میں مصنف نے عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ آخر میں حکیم منظور نے خودی کی قوت کے بارے میں اپنے نظریئے کی وضاحت کی ہے۔ ملاحظہ کیجئے

'بس فلک کو آنکھ کی تل میں سمانے کی قوت خودی کی قوت ہے اور خودی کی قوت، قوتوں کے سرچشمے سے سیراب ہونے کی قوت عطا کرتی ہے'[1]

حکیم منظور نے بارہویں باب میں اقبال کی وسیع المشربی کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں جن ماہرین یا ناقدین نے سوال اٹھائے ہیں یا شکوک کا اظہار کیا ہے۔ حکیم منظور نے ماہرانہ انداز میں فنی دلائل کے ساتھ انہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

'ہمارے اکثر دانشور اقبال کو یا تو کٹھ حجتی ملا کے طور پر پیش کرنے میں اپنی علمی استعداد کو بروئے کار لاتے ہیں یا پھر انہیں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک درویش ثابت کرنے میں زورِ قلم صرف کرتے ہیں۔ کچھ ان کو تفصیلی سمجھتے تھے اور کچھ ان کو اشتراکیت کا علمبردار

[1]...... حکیم منظور۔ اقبال ایک تذکرہ۔ ص ۸۳

سمجھتے ہیں۔ کچھ انہیں وطن پرست اور کچھ انہیں وطنیت بیزار دانشور سمجھتے ہیں۔ کچھ انہیں کٹر مسلمان اور کچھ انہیں خالص فلسفہ داں سمجھتے ہیں۔ کچھ ان کے خیالات کا تعلق ہیومنزم سے جوڑتے ہیں اور کچھ انسانیت کے وسیع تر معنوں میں انہیں سمجھنے کا جتن کرتے ہیں۔ سارے ان ہی کی تحریروں سے اقتباسات پیش کرتے ہیں اور اپنے نقطہ نظر کو درست ثابت کرنے کا جتن کرتے ہیں۔ یہ تضاد جو اقبال پر لکھنے والوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ یہی ان کے وسیع المشرب ہونے کا ایک بین ثبوت ہے۔[2]

اس باب کے آخر میں حکیم منظور قارئین سے ایک التجا کرتے ہیں کہ اقبال کو مسلمان صرف اپنا اور ہندو صرف مسلمانوں کا شاعر و خطیب نہ سمجھیں۔

تیرہویں باب میں 'مجتہد اقبال' کے عنوان سے اقبال کے اجتہادی پہلو کو واضح کیا گیا ہے۔ حکیم منظور نے دلائل و براہین کی مدد سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال اسلامی فکر و نظر میں ہر سطح پر اجتہاد کے قائل تھے۔ انہوں نے اس ضمن میں ان مجتہدین اسلام کی کوششوں کی تعریف کی ہے جنہوں نے اس سلسلے میں اہم کارنامے انجام دئے ہیں۔ اقبال نے اپنے انگریزی خطابات The reconstruction of Religious Thoughts in Islam میں اسلام کے اجتہادی پہلو پر زور دیا ہے۔ ان خطابات کو اردو میں تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے عنوان سے سید منیر نیازی نے ترجمہ کیا ہے۔ حکیم منظور اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

'اقبال ساری عمر یہی اجتہاد کرتے رہے اور اس فلسفہ فعالیت کی ترویج و اشاعت کیلئے کوشاں رہے جو مذہب اسلام کی روح ہے۔

۲......حکیم منظور۔ اقبال ایک تذکرہ۔ ص ۸۴

وہ صحیح معنوں میں بالغ نظر اور صائب الرائے مجتہد تھے۔[1]

چودہویں باب میں حکیم منظور نے اقبال کی بذلہ سنجی کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی رائے میں فلسفیانہ سوچ رکھنے والا بذلہ سنجی کے عناصر سے عاری ہوتا ہے۔ اقبال چونکہ ایک بے بدل مفکر اور اعلیٰ درجے کے فلسفی واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ عین ممکن تھا کہ علامہ کے کلام میں بذلہ سنجی کا فقدان ہوتا۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ہے۔ علامہ کے مزاج میں بذلہ سنجی کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ اکثر دوستوں سے بے تکلفی سے پیش آتے تھے۔ اقبال چونکہ دانائے راز تھے اس لئے وہ ہر شخص سے اس کے مزاج کے مطابق پیش آتے تھے۔ حکیم منظور نے اس باب میں علامہ کی بے تکلفی اور بذلہ سنجی کے متعدد واقعات درج کئے ہیں۔ جس سے نہ صرف علامہ کے مزاج کے متعلق آگاہی ملتی ہے بلکہ حکیم منظور کی سراپا نگاری کے فن میں مہارت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اقبال کی شخصیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'اقبال کی تحریروں سے لگتا ہے کہ یہ شخص خاصا خشک مزاج، بارعب، سنجیدہ اور ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دینے والا انسان رہا ہوگا۔ واقعہ البتہ یہ ہے کہ اقبال ہر رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ درون خانہ وہ ایک اور ہی اقبال ہوا کرتے تھے، فلسفیوں اور دانشوروں کے درمیاں بیٹھنے والا الگ ہی قسم کا اقبال تھا۔ یاروں کے ساتھ جو اقبال اٹھتا بیٹھتا تھا وہ اور ہی قسم کا اقبال تھا۔ وہ محفل اور موقعہ کی مناسبت سے اپنی شخصیت کو ڈھالنے پر قادر تھے۔ یہ نفسیاتی طور پر ایک زبردست عزم وارادے کے مالک کی شخصیت ہے۔'[2]

مندرجہ بالا اقتباس سے اقبال کی شخصیت کے جو نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں

1...... حکیم منظور۔ اقبال ایک تذکرہ۔ ص ۹۲

2...... حکیم منظور۔ اقبال ایک تذکرہ۔ ص ۹۴

حکیم منظور نے کئی واقعات کے حوالے سے انکو معتبر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا پندرہواں باب 'اساتذہ کے حضور میں' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ حکیم منظور نے اس باب میں علامہ کی ذہنی تربیت کرنے والے تمام اساتذہ کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے علامہ کی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں مولانا سید میر حسن، پروفیسر آرنلڈ اور نواب مرزا داغ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر قرار دیئے گئے ہیں۔ حکیم منظور کے مطابق اقبال کی عربی و فارسی پر کامل دستگاہ کے پیچھے سید میر حسن کا ہاتھ ہے۔ جن کے حضور اقبال نے جگہ جگہ عقیدت کے پھول نچھاور کئے ہیں۔ حکیم منظور نے ایک ایسا واقعہ قلم بند کیا ہے۔ جس میں اپنے استاد کے تئیں عقیدت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔

> انہیں (اقبال کو) ۱۹۲۲ء میں نائٹ ہڈ کی پیشکش کو منظور کرنے کا مرحلہ پیش آیا تو انہوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا 'میں اس خطاب کو صرف اس صورت میں قبول کر سکتا ہوں کہ میرے استاد میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دیا جائے'۔ اس پر پوچھا گیا کہ کیا میر صاحب کی کوئی تصنیف ہے تو اقبال نے جواب دیا، 'میں ان کی زندہ تصنیف ہوں۔ اس ایک جملے نے میر حسن کو شمس العلماء بنا دیا۔ جو خطاب انہیں ۱۹۲۴ء میں ملا۔[1]

اس کے علاوہ علامہ نے استاد پروفیسر آرنلڈ کی خدمات کا بھی کھلے الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے علامہ کے اندر فلسفہ کا شائستہ اور ستھرا مذاق پیدا کیا۔ حکیم منظور نے علامہ کے خلوص اور جذبے کو بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شعر و شاعری میں علامہ نے نواب مرزا داغ سے بھی کسب فیض اٹھایا۔ علامہ داغ کی موت پر ایک انتہائی اہم مرثیہ لکھ کر اپنے استاد خراج عقیدت پیش کیا

[1]...... حکیم منظور۔ اقبال ایک تذکرہ۔ ص ۹۹

ہے۔ غرض حکیم منظور نے کلام اقبال کے علاوہ حیات اقبال کے ذریعے اساتذہ کے احسانات کو کئی جگہ یاد کر کے ان کے تئیں عقیدت کے اظہار کی کامیاب نشاندہی کی ہے۔

سولہویں باب میں حکیم منظور نے اقبال کے دوستوں کی طویل فہرست فراہم کی ہے۔ جو کل اکیس حضرات کے نام گرامی پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ذی اثر اور صاحبِ حیثیت لوگ بھی اقبال کے دائرۂ احباب میں شامل تھے۔ حکیم منظور نے فرداً فرداً ان کا ذکر کیا ہے۔ کچھ واقعات کے بیان کی مدد سے حکیم منظور نے اقبال کی شخصیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ باوجود بلند رتبے کے اقبال میں دوست پروری اور احسان مندی کے جذبات بدرجۂ اتم موجود تھے۔

آخری باب میں فاضل مصنف نے 'اقبال اور خاک ارجمند' کے عنوان اقبال کی کشمیر سے قربت وعقیدت کو واضح کیا ہے اور کلام اقبال سے بطور نمونہ کچھ ایسے منتخب اشعار پیش کئے ہیں جن میں وادیٔ کشمیر کے حسن اور خوبصورتی کی تصویریں جھلکتی ہیں۔ اور اقبال کی گہری عقیدت ومحبت کا خلاصہ بھی ہوتا ہے۔ اس سرزمین کے ساتھ اقبال کا تعلق دل و ذہن کی پنہائیوں میں رچا بسا تھا۔ اسی لئے حکیم منظور نے کشمیر کو خاکِ ارجمند کا نام دیا ہے۔ اس باب کے مطالعے سے حکیم منظور کی تاریخ ادبیات کے ساتھ گہری وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ مصنف نے کشمیر کی صدیوں کی تاریخ کو چند سطور پر بیان کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

مندرجہ ذیل دو اشعار جن میں اقبال نے کشمیر کی پوری تمدنی اور تہذیبی تاریخ کا بیان کیا ہے دراصل کلامِ اقبال سے یہ انتخاب حکیم منظور کی شعر فہمی کی دلالت کرتا ہے۔

آج ! وہ کشمیر ہے محکوم ومجبور وفقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

آہ! یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ

ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیر گیر

حکیم منظور نے 'اقبال ایک تذکرہ' میں جن موضوعات کو پیش کیا ہے وہ انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ مصنف کو اقبال کے فکر و فن سے جو رغبت اور لگاؤ رہا ہے یہ کتاب اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ حکیم منظور نے بڑے سادہ اور سلجھے ہوئے انداز میں ان موضوعات کو اپنے منطقی انجام تک پہنچایا ہے اور یہ کتاب لکھ کر انہوں نے اقبالیات میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب خاص کر طلبہ کیلئے مفید اور کارآمد ہے۔ بشیر احمد نحوی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

'حکیم صاحب نے خوبصورت عنوانات کے تحت اقبال کی زندگی، شخصیت، فکر، فن اور حیات و ممات کے ضمن میں ان کے فکری پیمانوں کا احاطہ کرنے کی سعی بلیغ کی ہے اور ان سرچشموں کی وضاحت کی ہے۔ جن سے اقبال سیراب اور فیض یاب ہوئے ہیں۔'[1]

مذکورہ کتاب میں مصنف نے جو مختصر اندازِ بیان اپنایا ہے وہ اس برق رفتاری کے دور میں اقبال شناسی اور اقبال فہمی کیلئے نہایت ہی موزوں و مناسب ہے۔ ساتھ ہی مصنف کے انداز بیاں کی سلاست نئی نسل کے مطالعے کیلئے نہ صرف باعث تحریک ہوگی بلکہ تخلیق نثر کے سلسلے میں بھی یہ کتاب محرک کا کام کرے گی۔

حکیم منظور نے کئی تنقیدی تبصرے تحریر کئے ہیں۔ ایسے تبصرے بہترین نثر پاروں کی شکل میں موجود ہیں۔ مظفر ایرج کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے حکیم منظور کے تنقیدی شعور کی بالیدگی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایرج کے بات کہنے کا سلیقہ اور اس سے بھی زیادہ کہی جانے والی

---

1 ...... ڈاکٹر بشیر احمد نحوی۔ پیش گفتار۔ اقبال ایک تذکرہ

بات کا انتخاب جو بظاہر سادہ مگر فکر کے اعتبار سے تہہ در تہہ معنی کی حامل ہوتی ہے، ان سے توقعات وابستہ کرنے کی بجا ترغیب دیتے ہیں۔"[1]

[1]...... حکیم منظور۔ سرورق۔ ابجد۔ (مجموعۂ کلام۔ مظفر ایرج)

حکیم منظور بحیثیتِ صحافی

آزادی سے قبل ریاست جموں وکشمیر میں تحریر وتقریر کی آزادی مفقود تھی۔ محکوم اور حاکم کے درمیان ظلم وجبر کے بلند وبالا قلعہ بند دیواریں کھڑی تھیں لیکن آزادی حاصل ہونے کے ساتھ ہی عوام کو اظہارِ خیال کا بھی حق حاصل ہوا اور جب کبھی ظلم کی دست درازیوں نے غریب عوام کو شکار بنانے کی کوششیں کیں تب تب عوام کی مظلوم آواز سے حکومت کی مضبوط دیواریں لرز اٹھیں۔ اس بات سے سبھی واقف ہیں کہ جہاں ریاست کی ثقافتی تاریخ سے لیکر دوسرے کئی ہمہ گیر پہلوؤں کی بنیاد مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں پڑی۔ وہیں اس ریاست میں اردو صحافت کا آغاز بھی انہی کے عہد میں ہوا۔ انہوں نے ۱۸۵۶ء میں نئے رجحانات کی دستک سنی تھی اور بدیا بلاس جاری کر کے ریاست میں اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ درباروں کے سائے میں پروان چڑھنے والا یہ ہفت روزہ آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور اردو اور دیوناگری رسم الخط میں خبریں چھپتی تھیں۔ بدیا بلاس اخبار کے صفحات جو اردو کیلئے مختص تھے ان میں چھپی خبروں یا سرکاری اشتہارات ہی سے ریاست جموں وکشمیر میں صحافت کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف نے اخبار رنبیر شائع کیا۔ جس سے نہ صرف تمام مکتبِ صحافت کو استحکام حاصل ہوا بلکہ صحافت کی صلاحیت اور اس کا جنوں رکھنے والوں کیلئے اظہار وابلاغ کے وسیع تر امکانات فراہم ہوئے۔ ادھر کشمیر وادی میں پریم ناتھ بزاز نے وتستا اور پھر ہمدرد جاری کر کے صحافت میں ایک جہت ساز تبدیلی کی سعادت حاصل کر لی۔ شخصی حکومت کے خاتمے کے بعد اردو صحافت کو کبھی زوال کا منہ نہیں دیکھنا پڑا۔ البتہ

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد ریاست جموں وکشمیر کی صحافت سیاست کے دلدل میں پھنس کر رہ گئی۔ اس طویل اور دل آزار سفر میں صحافت کبھی کبھی محض نعرہ بازی اور تشہیر وترغیب کا ذریعہ بن کر رہ گئی۔

ریاست کی اردو صحافت کیلئے نہایت ہی آزمائش کی گھڑی وہ تھی جب ۲۶ سال کی اشاعت کے بعد ۱۸ ر مئی ۱۹۵۰ء کو رنبیر کی اشاعت بند ہوئی لیکن اس کے بعد جموں اور وادی کے علاوہ پونچھ اور سورن کوٹ سے بھی مقتدر صحافیوں کی کوششوں سے کئی چھوٹے بڑے اخبار اور جریدے شائع ہوتے رہے اور تب سے اخباروں کی اشاعت میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی وجہ نہ صرف اردو زبان سے دلچسپی اور محبت کا نتیجہ ہے بلکہ زندگی اور صحافت کا آپسی گہرا رشتہ ہے کیونکہ اس سے نہ صرف انسان روزمرہ کے حالات و واقعات کی تفصیل جان سکتا ہے بلکہ شعر وادب، کھیل، صنعت وحرفت کے ساتھ ساتھ دوسرے موضوعات پر بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ موجودہ دور میں کاروباری اشتہارات کیلئے تو صحافت ایک گراں قدر رول انجام دے رہا ہے۔

۱۹۶۶ء میں ریاست میں مرکزی پریس ایکٹ کے نفاذ سے صورتِ حال میں قدرے بہتری محسوس کی جانے لگی۔ اب صحافت کا سفر ایک نئے پڑاؤ پر تھا۔ جہاں سے صحافت نے ایک نئے عزم کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر میں اپنے سفر کا آغاز کیا اور صحافیوں کی جو جماعت کھل کر سامنے آئی اس میں ریاست کے نامور ادیب اور شعراء شامل تھے۔ ان لوگوں نے اردو صحافت میں نہ صرف ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا بلکہ وہ اپنی سچی اور بے باک آواز کے ذریعے صحافت کے میدان میں اپنے لئے ایک اہم مقام بنانے میں بھی کامیاب رہے۔ ان صحافیوں کی صف میں حکیم منظور بھی شامل ہو گئے یہ وہ وقت تھا جو بقول ڈاکٹر مجید مضمر:۔

"عام شاعروں کیلئے مرثیہ لکھنے کی عمر ہوتی ہے"

لیکن نہ جانے کس ارادے سے حکیم صاحب نے اس میدان میں قدم رکھا

اور اپنا ایک اخبار 'خبر ونظر' جاری کیا۔ ان کے میدانِ صحافت میں قدم رکھنے پر اکثر حضرات کو حیرت بھی ہوئی کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مادی آسائشیں حاصل کرنے کیلئے صحافت کا آسان راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک حکیم منظور کی ذات کا تعلق ہے وہ اس جذبے سے مبرا ہیں۔ ڈاکٹر مجید مضمر لکھتے ہیں:

"حکیم منظور مصلحتوں میں یقین نہیں رکھتے ۔ وہ غالباً مادی آسائشوں کی آلائشوں سے بھی دور ہیں ورنہ خبر ونظر نکالنے اور اس کی زیادہ تر کاپیاں مفت تقسیم کرنے کا گھاٹے کا سودا کبھی نہیں کرتے۔"[1]

صحافی پر زبردست ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کو اپنی آنکھوں کو خوردبین کے طور پر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ وہ ہر طریقے سے سچائی کا متلاشی رہتا ہے۔ حکیم منظور چونکہ خود سچا انسان ہے اور صحافی کیلئے سچا ہونا شرطِ اولین ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

حقیقت زاد ہوں منظور میر المیہ یہ ہے
میں چاہوں بھی تو باتیں داستانی لکھ نہیں سکتا

یہی وجہ ہے کہ کچھ سچائیوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے تہذیبی ورثے اور ثقافتی دولت کی تفصیلات عوام الناس تک پہنچانے کے خواہاں تھے اور اس کام کیلئے انہوں نے براہ راست صحافت کا راستہ اختیار کیا۔ اس سلسلے میں مجید مضمر لکھتے ہیں:

"حکیم منظور ایک نئی زبان، منفرد لسانیاتی نظام کا ایسا سچا شاعر ہے جو ایک طرف تو غزل کو اس کے تمام تر امکانات کے ساتھ برت رہا ہے اور دوسری طرف اپنی زمین اور زمانہ کو آتی جاتی نسلوں کو تمام تر تہذیبی، ثقافتی، سیاسی وسماجی تغیرات وانسلاکات کے ساتھ اپنے لہو کے اندر حرکت کرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس امتیاز کے ساتھ کہ اسکے اندر ماضی کے تمام اکتسابات اور مستقبل کے امکانات کی روح سرگرم ہے۔"[2]

---

[1]...... رنگ باتیں کریں۔ ڈاکٹر مجید مضمر ص ۹۴ [2]...... ڈاکٹر مجید مضمر۔ رنگ باتیں کریں۔ ص ۹۴

حکیم منظور ذکی الحس (Super Sensitive) ہیں اور ایسے شخص کیلئے مختلف واقعات کا فوراً اور دیر پا اثر قبول کرنا فطری عمل ہے۔ نتیجتاً ردعمل کے طور پر حکیم منظور نے صحافت کے توسط سے ایسے اثرات کا اظہار کرنا پسند کیا۔ حکیم منظور کیلئے جہاں عوام کی بے خبری باعثِ فکر تھی وہیں اظہار و ابلاغ کی امنگ اور تڑپ ان کے وجود میں طوفان کی طرح بپھر رہی تھی۔ لہٰذا وسعت یاب اور معیاری ہفت روزہ جاری کر کے انہوں نے اپنی روح کی تشفی کا ایک اور سامان پیدا کیا۔ اس اخبار کے لب ولہجہ میں طہارت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ صلاح وفلاح کا ترجمان یہ ہفت روزہ ہر لحاظ سے معیاری ہے۔ 'خبر ونظر' کے اکثر شمارے اٹھا کر دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ اپنی بے باکانہ آواز سے نہ صرف یہ کہ عوام میں ہر دلعزیز ہے بلکہ مبالغہ آمیز خبروں سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ خود لکھتے ہیں:

یہ ہاتھ کس لئے اگر نہ لکھ سکوں جو چاہوں میں
کہوں وہی جو تو کہے تو پھر زبان کس لئے

غضب خاموش ہیں ساری زبانیں
ستم کرتا ہوں میں محسوس سب، کچھ

میری زبان کس کے ہاتھ میں ہے یہ کون دیکھے یہ کون سوچے
گناہِ ناکردہ کی وضاحت کہ خود میرے اعتراف میں ہے

وہ ہمہ تن گوش تو ہیں لیکن اس کا کیا علاج
لب ہلانے کی ہی بس منظور آزادی نہیں

حکیم منظور ماہر زبان (Master of Languages) بھی ہیں یہی وجہ

ہے کہ وہ کسی بھی چیز کے ردِعمل میں اپنے جذبوں کو زبان دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ عوامی بیداری کے خواہاں ہیں اور اس مقصد کیلئے وہ خود کو وقف کرنا پسند کرتے ہیں۔ سماج میں پنپ رہی برائیوں سے وہ دل برداشتہ ہیں اور ایسے سماج کے متمنی ہیں جو حرص ولالچ، ریاکاری، لوٹ مار، دہشت گردی اور اخلاقی گراوٹوں سے پاک ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اخبار ''خبر ونظر'' کے اداریوں اور مختلف مضامین کے ذریعے تندرست معاشرے اور با اخلاق فرد کی تعمیر وتشکیل میں اپنا بھرپور تعاون دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حکیم منظور ہمیشہ ذہن کی تازگی کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور اپنے اشعار کے ذریعے وہ عوام کو ہوش مندی کی صلاح دیتے ہیں۔

نئے منظر کی بابت فیصلہ دل سے نہ لکھوائیں
یہ قصہ ذہن کا ذہن میں ہے روشنی کتنی
ہم ہی آنکھیں جیب میں رکھنے کے عادی ہو چکے ہیں
ورنہ آگے راستہ کھوٹا ہے یہ لکھا ہوا ہے

حکیم منظور نے بڑے انہماک اور آب وتاب کے ساتھ اخبار خبر ونظر ۱۹۹۶ء میں سرینگر کشمیر سے شائع کیا اور اس اخبار کی ادارت اور نگرانی خود ان ہی کے ہاتھ میں رہی۔ یہی اس کے چیف ایڈیٹر، ایڈیٹر اور پبلشر رہے۔ چار صفحات پر مشتمل یہ اخبار تازہ خبروں کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر بھی خبریں شائع کرتا رہا ہے۔ اخبار کی پیشانی پر حکیم منظور کا اپنا ایک شعر لکھا رہتا ہے

اے مرے کشمیر آنکھوں میں تری
میں سجاؤں عرش سے آگے کے خواب[1]

اس شعر کے ذریعے ان کے دل میں کشمیر کیلئے پنپ رہے جذبات کی عکاسی

[1]...... خوشبو کا نام نیا۔ حکیم منظور۔ ص ۲۴

ہوتی ہے۔اداریہ کے ٹھیک اوپر علامہ اقبال کے یہ تین اشعار چھپے ہوتے ہیں:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

علامہ اقبالؔ

خبر و نظر کی ترکیب بھی غالباً علامہ کے کلام سے ماخوذ ہے۔اس سے حکیم منظور کی علامہ اقبال سے عقیدت کے اظہار کا پتہ چلتا ہے۔یہ اخبار شروع ہی سے ہفت روزہ تھا اور گزشتہ گیارہ برسوں سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور قارئین کی دلچسپی کا باعث بنا ہوا ہے۔

خبر و نظر میں اکثر سیاسی خبریں کسی شاعر کے شعر یا کسی ایک مصرعے کی جلی سرخی کے تحت چھپتی ہیں۔مثال کے طور پر ۶/اکتوبر ۲۰۰۲ء کے ایک شمارے میں ہندوپاک کے آپسی تعلقات کے بارے میں ایک خبر کی سرخی کچھ اسطرح ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ انداز رہے
کل اگر ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

خبر و نظر کے اداریوں کی سرخیوں سے حکیم منظور کے شاعرانہ مزاج کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔اس سلسلے میں ۲۵/جولائی ۲۰۰۲ء یا ۲۸/مارچ ۲۰۰۲ء کے شماروں سے چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

"شاید کہ اتر جائے کسی دل میں میری بات"

''کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی''

''چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا''

''کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری''

خبر و نظر کے آئینے میں دیکھا جائے تو حکیم منظور ایک ایسے انشا پرداز ہیں جو اپنے قلم پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور اسے ضرورت اور موقع کی مناسبت سے استعمال کرتے ہیں ان کے نثر پاروں میں خواہ وہ سیاسی خبریں ہوں یا سماجی مسائل طنز و مزاح ہو یا تاریخ، اسلامیات ہو یا ادبیات، فصاحت و بلاغت کے دریا رواں دواں رہتے ہیں۔ موضوع خواہ کچھ بھی ہو ان کی پکڑ دھکڑ کمال کی ہے۔ زور بیان اور خطیبانہ لہجہ خبر و نظر کے اکثر اداریوں کا خاصا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے حکیم منظور کے احاطہ علم کی وسعتوں کا اندازہ ہوگا ملاحظہ کیجئے:

اداریہ

'ہمیں غور کرنا ہی پڑے گا'

''مروت اور مودت دو ایسے لفظ ہیں جنہیں بجا طور پر انسانی اقدار عالیہ کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ نعت کے حوالے سے مروت کے معنی ہیں: انسانیت، الحاق، محاظ، رعایت اور مودت کے معنی ہیں: پیار، محبت اور دوستی۔ ان معینوں کے بھی معنی دیکھیں تو معلوم ہو کہ انسانی اقدار کی وسعت، گہرائی اور گیرائی کا عالم کیا ہے۔ جب تک عالم انسانیت میں مروت و مودت کا چلن رہا دنیا میں امن و امان قائم رہا اور جس خرابے کو فرشتے آباد نہ کر سکے اسے غریب الدیار (انسان) کی مساعی جمیلہ نے گلستاں بنا دیا۔ فطرت کی سنت کے مطابق ارتقاء اور نموحیات کی ایک ضرورت ہے اور ناگزیر ضرورت ہے۔''

حکیم منظور نے اس اخبار میں جس موضوع کو بہت شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے وہ ادبیات ہے۔ خواہ وہ اردو ہو یا کشمیری یا پھر انگریزی۔ اس اخبار میں اکثر

موضوعات قسط وار چھپتے رہے ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف قارئین کے جذبہ تجسس میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ان کی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔ نتیجتاً وہ دوسرے ہفت روزہ کے انتظار میں رہتے ہیں۔ اس اخبار میں مقامی شعراء و ادباء کی تازہ تخلیقات کے ساتھ ساتھ بیرون ریاست دانشوروں اور قلمکاروں کی نگارشات بھی چھپتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ معیاری رسالوں اور اخبارات میں چھپی ہوئی نگارشات کے تراجم بھی قابلِ مطالعہ ہوتے ہیں۔ اس اخبار کے ذریعے ترجمہ نگاری کو ایک تحریک ملی۔ خبر ونظر زیادہ تر دانشور طبقے میں مقبول رہا ہے۔ حالانکہ عام قاری کیلئے بھی اس اخبار میں تمام تر دلچسپ موضوعات شامل ہیں۔ اس اخبار میں جو موضوعاتی مضامیں چھپتے ہیں وہ کبھی یا تو حکیم منظور اپنے نام سے شائع کرتے ہیں یا پھر کسی فرضی نام سے۔ ادیبوں کے لطائف بھی اس اخبار میں اچھی خاصی تعداد میں چھپتے ہیں۔ چونکہ حکیم منظور طنز ومزاح کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس اخبار میں طنز ومزاح کا ایک باضابطہ کالم چھپتا ہے۔ اور تقریباً زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس اخبار میں اخلاقی مضامین کی اشاعت جہاں سماجی فلاح و بہبود کیلئے تحریک کا کام کرتی رہی ہے۔ وہیں اردو کے نامور صحافیوں اور سیاست دانوں کے حالات زندگی پر مبنی مضامین اس اخبار کو چار چاند لگاتے رہے ہیں۔ ایسے موضوعات کو شخصیت نگاری کے تحت شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس اخبار میں حکیم صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبارات 'الہلال' اور 'البلاغ' محمد علی جوہر کا 'زمیندار' اخبار 'جام جہاں نما' جیسے اردو صحافت کے موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں۔ حکیم منظور ہمیشہ دیدہ دلیری کا ثبوت دیتے ہوئے وقتی حکومت کے خلاف کھلم کھلا لکھتے ہیں اور تلخ لیکن دوستانہ لہجے میں حکومت سے استدعا کرتے ہیں۔ مقامی خبروں کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی خبریں اس اخبار کی زینت بنتی ہیں۔ دوسرے اخباروں کے مقابلے میں ریاست میں خبر ونظر کا مقام منفرد اور یکتا ہے۔

اخبار 'خبر ونظر' ریاست کے دوسرے تمام ماہناموں اور روزانہ اخبارات سے

طاقتور اور توانا ہے کیونکہ یہ اخبار سچائی پر مبنی ہے اور کسی فضول موضوع کی طرف انگشت نمائی نہیں کرتا نہ ہی کسی سے بے جا دشمنی یا دوستی کا دم بھرتا ہے۔ حکیم منظور کا ایک شعر دیکھئے۔

کسی تیغ تشنہ لہو کو میں نہیں لکھ سکا ہوں کہ پھول ہے
یہ سلیقہ جس سے سیکھتا وہ سبق ہی میں نے پڑھا نہیں

جہاں خبر و نظر کے معیار، زبان و بیان اور موضوعات کا تعلق ہے تو یہ باقی اخبارات سے ہٹ کر اپنی انفرادیت قائم کئے ہوئے ہے۔ وہیں اس اخبار کی انفرادیت اس میں بھی ہے کہ یہ اخبار جہاں بے جا تنقید و ملامت سے گریز کرتا ہے وہیں فضول قسم کے اشتہارات اور خبریں نہیں چھاپتا جن میں حقیقت نہ ہو یا پھر افواہوں پر مبنی ہو۔ جنہیں پڑھ کر ریاست کے دانشور طبقے کی طبیعتیں مکدر ہوتی ہوں۔ ایسی آلائشوں اور فضول روشوں پر یہ اخبار چلنے سے قطعی گریز کرتا ہے۔ ان وجوہات کی بناء پر اس اخبار کی اشاعت میں جہاں بے پناہ ترقی ہوئی وہیں یہ دانشور طبقے کا منظورِ نظر بھی بنتا گیا۔

حکیم صاحب کی صحت علیل رہنے کی وجہ سے اخبار کی مسلسل اشاعت میں چند رکاوٹیں درپیش آتی رہیں۔ کیونکہ خود حکیم منظور کا اس اخبار کی اشاعت میں ایک اہم رول رہا ہے۔ لیکن موضوعات اور زبان کے اعتبار سے اس اخبار میں کبھی گراوٹ نہ آئی۔ یہ مسلسل اپنی انہی روشوں پر گامزن رہا جن پر حکیم منظور نے اسے شروع کیا تھا۔ ''خبر و نظر'' صحافت کی تاریخ میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتا ہے اور حکیم منظور کے اس بیان کی تائید کرنی پڑتی ہے جو ہر شمارے کے سرورق کی زینت ہے اور کچھ اسطرح ہے:

'خبر و نظر محض ایک اخبار نہیں:
ایک تحریک ہے، ایک تاریخ ہے'

حکیم منظور کا غیر مطبوعہ کلام

حکیم منظور ایک عہد ساز شاعر ہیں۔ ان کا شعری منظر نامہ وسیع وعریض ہے۔ جہاں اب تک ان کے کئی شعری مجموعے اشاعت پذیر ہوئے ہیں، وہیں ان کے غیر مطبوعہ کلام کی تعداد بھی خاصی ضخیم ہے۔ جس پر الگ سے کام ہو سکتا ہے۔ ان کے یکے بعد دیگرے کئی مجموعوں کے منظر عام پر آنے سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ ان کے اندر تخلیق کا ایک بحرِ بیکراں موجود ہے۔ جس کی ہر لہر میں تازگی اور تلاطم کا احساس ملتا ہے۔ حکیم منظور کے غیر مطبوعہ کلام کی ضخامت کے بارے میں ظریف احمد ظریف لکھتے ہیں:

'حالیہ ملاقات میں منظور نے بتایا کہ ان کے شعری ذخیرے میں تقریباً ایک درجن غیر مطبوعہ شعری مجموعات کا مواد موجود ہے۔'[1]

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ زود نویسی کلام کی فنی پختگی میں کمی کا باعث ثابت ہوتی ہے لیکن حکیم منظور کے ہاں فن کے لحاظ سے ایسا کوئی نقص دیکھنے کو نہیں ملتا ہے اور نہ ہی انکے تخیل کی پرواز میں کسی کمی کا احساس ہوتا ہے بلکہ ان کی شعری بساط ان کے اپنے نادر اسلوب کی قوت پر کھڑی ہے۔

حکیم منظور کے غیر مطبوعہ کلام کا جائزہ پیش کرنے سے قبل اس بات سے آگہی حاصل کرنا ضروری ہے کہ کیا شاعر نے اپنے کلام میں داخلی یا خارجی، لفظی یا معنوی کسی بھی سطح پر کسی قسم کی تبدیلی کو راہ دی ہے یا نہیں۔ حکیم منظور کا آخری مطبوعہ

[1]..... ظریف احمد ظریف۔ ایک ملاقات

اردو شعری مجموعہ 'سخن برف زاد' ہے جس کا سن اشاعت ۲۰۰۲ء ہے۔ ظاہر ہے کہ حکیم منظور جیسے شاعر کا قلم مصروفِ عمل ہے اور وہ پورے انہماک کے ساتھ اپنے شعری اثاثے میں اضافہ کرر ہے ہیں۔ حکیم منظور کے ایسے کلام میں تنوع بھی ہے اور رنگا رنگی بھی۔ نئے اور اچھوتے مضامین برتنا حکیم منظور کا خاصا ہے۔

شاعر سماج کا ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو حساس ہونے کی وجہ سے روزمرہ ہونے والی چھوٹی سی چھوٹی تبدیلیوں کو بھی محسوس کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اپنے آس پاس رونما ہورہے واقعات، بدلتے حالات اور ذاتی کشمکش کے نتیجے میں فراہم ہونے والے تجربات کو وہ شعری شکل میں ادا کرتا ہے۔ حکیم منظور نے بھی یہ حق نہایت خلوص کے ساتھ ادا کیا ہے۔ وہ اپنے تجربوں کا بہتر سے بہتر تخلیقی اظہار کرنے پر قادر ہیں۔ وہ ہمیشہ نرم، شائستہ اور غنائیہ لہجے کے روادار ہیں اور تخلیقِ فن کے بہتر اور منفرد لمحوں میں اپنی بے پناہ شعری صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

حکیم منظور کے غیر مطبوعہ کلام کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ نت نئے تجربات سے وابستگی کا اظہار حکیم منظور کا خاصا ہے۔ ان کے کلام میں رنگا رنگی اور وسعت کے امکانات برابر نظر آرہے ہیں۔ اور وہ تازہ کاری کا بھرپور مظاہرہ کرر ہے ہیں۔ وہ فن کے اسرار و رموز خصوصاً تخلیقی عمل کے طلسماتی سفر کے تعلق سے برابر قاری کی رہنمائی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ وقت کی کروٹ کے ساتھ ہی ساتھ شاعر کے اندر انا پرستی کا جذبہ اور گہرا تا نظر آتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ جذبۂ انا کی کمی انسان کو کوتاہ قد کر دیتی ہے۔ ایسا انسان آدھا آدمی ہوکر زندگی گزارتا ہے۔ شاعر کے اندر چونکہ انا کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے اور یہی جذبہ اسکو کسی بھی طاقت کے آگے جھکنے سے باز رکھتا ہے۔ اس بات کی تائید انکے ہی اس شعر سے ہوتی ہے ملاحظہ کیجئے۔

اجنبت تھی انا کا مسئلہ سارا: کہ یوں
وہ بھی لب بستہ رہا میں نے بھی پوچھا کچھ نہیں

حکیم منظور جذبوں کو زبان دینے میں پوری ایمانداری برتتے ہیں۔ وہ متضاد کیفیات کو منفرد لہجے کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں اور قاری کے سامنے ان کیفیات کو تمام تر محسوسات کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

میرا دکھ : وہ خود نہ کیوں سمجھا کیا چاہئے
اور اسے افسوس میں نے اس سے مانگا کچھ نہیں

اس شعر میں دکھ اور افسوس کی کیفیات کو ایک ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ دو الگ الگ بشری کیفیات کے خوبصورت امتزاج میں اس شعر کا اصلی حسن پوشیدہ ہے۔ یہاں بھی اصل موضوع شاعر کی انا پرستی ہی ہے۔

حکیم منظور کیلئے گزرے ہوئے لمحات باعثِ راحت ہیں اور ایسے لمحات کو وہ خوش وقتی سے تعبیر کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاعر گوشہ نشینی میں ہی عافیت سمجھتا ہے اور تنہائی کا عالم اسے عزیز لگنے لگا ہے۔ حالانکہ اپنے پورے مطبوعہ کلام میں حکیم منظور کے قلم سے ایسا شعر شاید ہی نکلا ہو جہاں وہ تنہائی، پسپائی یا غم والم کی چادر اوڑھے دنیا ومافیہا سے الگ تھلگ نظر آرہے ہوں۔ لیکن ان کے ہاں جدیدیت کے موضوعاتی روش سے گریز کا احساس ملتا ہے اور وہ جدید شعراء کی طرح مایوسی اور کلبیت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ تنہائی کے لمحوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایسی چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

سب کچھ اپنی جگہ ہو کر بھی سب کچھ بدلا لگتا ہے
مہر بہ لب ہوں، میرے اندر کچھ ٹوٹا سا لگتا ہے

کیا خوش وقتی! کوئی محفل بات میری اور ذکر میرا
کیا پامالی! تنہا رہنا سب سے اچھا لگتا ہے

میری نظریں بدلی ہیں یا آئینوں میں عیب پڑا
دایاں، بایاں، چھوٹا، لمبا، سیدھا، الٹا لگتا ہے

حکیم منظور کی شاعری کا نہ صرف خارجی منظر نامہ ارضِ کشمیر سے متعلق نظر آتا ہے۔ بلکہ داخلی منظر نامہ بھی کشمیر کی دلفریب خوبصورتی کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیب، ثقافت، زندگی کی بدلتی کروٹیں اور اہل کشمیر کا دکھ اور کرب سب کچھ العباد کے راستے سے حکیم منظور کے شعری اظہار میں داخل ہوا ہے اور زمین و زمانے کی حسیت کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ ساتھ شعری تجربوں کو توانائی اور اظہار کو استناد فراہم کرتا ہے۔

یہ جہلم پُر موج تھا پانی اسکا چاندی جیسا تھا
میرا یہ کہنا بچوں کو اک افسانہ لگتا ہے

صبح ہوئی ہے لیکن سارے سوئے ہوئے سے لگتے ہیں
سورج میرے شہر سے باہر ٹھہرا ٹھہرا لگتا ہے

گل بے زر ہیں پیڑ اداس ہیں، بارش شعلہ پیراہن
رات سی خاموشی طاری ہے طوفاں آیا لگتا ہے

حکیم منظور کے ہاں غور و فکر کی کارفرمائی موجود ہے۔ یہ ان کے غور و فکر کا ہی نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنے اشعار میں کئی جگہ فلسفیانہ نکات ابھارے ہیں۔ اس قسم کے اشعار کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ شاعر کے فلسفیانہ افکار گہرے ہوتے جارہے ہیں۔ حالانکہ اپنی پوری شاعری میں حکیم منظور قاری کو فلسفیانہ مسائل میں کہیں الجھاتے نظر نہیں آتے لیکن یہاں ایسے چند اشعار جن سے ان کی فلسفیانہ افکار کی نشاندہی ہوتی ہے نقل کئے جارہے ہیں۔

آب کا اظہار ہے معنی میں دریا کچھ نہیں
یہ معمہ میں ہی سمجھا! میں ہی سمجھا کچھ نہیں

ہیں طلائی پر ہی تتلی کا وجود اس نے کہا
بات تھی معیار کی، میں ورنہ کہتا کچھ نہیں

کاش میں اس کیفیت کو نام دے سکتا کوئی
جمع بھی پورا ہوا، حاصل بھی آیا کچھ نہیں

حکیم منظور کی شاعری میں پیکر تراشی کا عمل حسیاتی طور پر ان کی ذہنی بیداری کا واضح نشان ہے۔ ان کے ہاں حواس کی تشفی کا پورا سامان موجود ہے۔ مناسب پیکروں کے استعمال کی مدد سے حکیم منظور احساس اور اظہار کے درمیانی فاصلے کو کم سے کم کر دیتے ہیں۔ یہ دراصل لسانی سطح پر ان کی بیداری کا نتیجہ ہے۔ حکیم منظور کے ہاں علامتی اظہار میں جو برجستگی اور بے ساختگی رہی ہے وہ اب بھی اسی طرح پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔

مجھ کو لکھی لگتی ہے معصومی اس کی آنکھوں میں
اس کا چہرہ صبح کا پیلا منظر ایسا لگتا ہے

شعلہ آسائش پھولوں کی سختی آئینوں جیسی
اس کا روپ کوئی بھی، کچھ بھی، مجھ کو اچھا لگتا ہے

یہاں بھی شاعر اپنے منفرد لہجے کی پہچان بنائے ہوئے ہے۔ حکیم منظور کے غیر مطبوعہ کلام سے جہاں انکے منفرد لب ولہجہ کا پتہ چلتا ہے وہیں انکے اکثر موضوعات پہلے سے زیادہ حقائق پر مبنی نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے مطبوعہ

کلام پر عبدالقادر سروری کی دی گئی رائے صادق آتی ہے۔

"حکیم منظور کی غزلوں میں موضوعات اور اسلوب دونوں میں روایت پسندی بہت کم ہے۔ یہ نئے عہد کی غزل ہے جس کا رجحان حقائق اور آدرشوں پر ہے"[1]

حکیم منظور کے اظہار میں ایک بہاؤ ہے۔ انکے شعری تجربوں کی تخلیقی آنچ میں کسی کمی کا شائبہ بھی نہیں گزرتا۔ یہ دراصل تخلیق کار پر منحصر ہے کہ وہ اپنے تخلیقی تجربے کے اظہار کیلئے لفظ میں موجود امکانی قوت کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ اس عمل میں حکیم منظور پوری طرح سے کامیاب نظر آتے ہیں۔ ایسا اس لئے کہ وہ جہاں زباں پر پوری دسترس رکھتے ہیں وہیں وہ اسکے ہر رمز سے آشنا بھی ہیں۔

بات رکھی ہے جنونِ گُل پرستی نے میری
ورنہ پنہاں آندھیوں سے اس نے رکھا کچھ نہیں

حکیم منظور کے اشعار میں جو فکری ارتقاء ملتا ہے وہ قاری کے جمالیاتی حس کو سکون بخشتا ہے۔ ساتھ ہی کسی طرح کے الجھاؤ اور تناؤ کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ تازہ اشعار کے تناظر میں دیکھا جائے تو شاعر کو سکونِ قلب حاصل نہیں ہے۔ بیتے لمحوں کی شکستگی ان کے 'آج' کا عنوان بن گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

ٹوٹتے لمحوں کا ہی لکھا نہیں جاتا حساب
ورنہ اے منظور، لکھنے کیلئے کیا کچھ نہیں

حکیم منظور کی صحت کی ناسازگاری ان کے تخلیقی عمل میں مسلسل رکاوٹ کا باعث بن رہی ہے۔ حالانکہ حکیم منظور جیسا حوصلہ مند شاعر تواتر کے ساتھ لکھ رہا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر جہاں ان کی پریشانی کا مظہر ہے وہیں گزرے ہوئے شاندار کل کی خوش وقتی کی جھلک بھی دکھاتا ہے۔

[1]...... سلیم سالک، ادب نامہ کشمیر عظمیٰ روزنامہ۔ دسمبر ۲۰۰۷ء

ترچھا پن انداز وادا میں نئے وہ خوشبو ہنسنے میں
زخم اب کے منظور تو کچھ گہرا ہی کھایا لگتا ہے

حکیم منظور کی غیر مطبوعہ شاعری بھی تخلیقی سطح پر بقیہ شعری سرمائے سے مختلف نہیں ہے۔ یہاں تک کہ احساس، جذبے اور تجربے کی سطح پر بھی اسے ایک فکری تسلسل کا نام دیا جاسکتا ہے۔

حکیم منظور کا مقام و مرتبہ

ریاستی سطح پر اردو شعری اُفق پر کئی شعراء اپنے تمام تر رنگارنگی اور برجستگی افکار کے ساتھ اُبھرے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق شعری سرمائیے میں اضافہ کرتے رہے۔ معدودے چند کے ان میں سے اکثر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب بھی رہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اردو ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان ہے اور تینوں خطوں (جموں، کشمیر اور لداخ) کے علاوہ ملک اور بیرون ملک رابطے کا کام کرتی ہے۔ باوجود اسکے اردو یہاں کسی بھی طبقے کی مادری زبان نہیں ہے۔ پھر بھی متعدد شعراء وادباء نے اردو شعر و ادب کے چمنستان میں نت نئے رنگ برنگے گل بوٹے اگائے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی ایسی شعری ونثری کاوشیں نہ صرف قابل صد ستائش ہیں بلکہ اہم اضافے کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ ایسی جو تخلیقات معرض وجود میں آئی ہیں اگر انکو ادب کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو یقیناً کسی بھی زبان کے تخلیقی ادب کے مقابلے میں معیاری ثابت ہوں گی۔

ریاستی شعری سرمائیے پر نگاہ ڈالتے ہی کئی ایسے شعراء کا نام سامنے آتا ہے جنہوں نے اپنی تخلیقات کے بل پر اپنی پہچان بنائی اور اردو دنیا میں ان کی آواز مستند قرار دی گئی۔ ایسے ہی شعراء میں ایک نام جو پچھلی کئی دہائیوں سے کسی صلے یا ستائش کی تمنا کے بغیر شعر و ادب کے دامن کو خوشبوؤں سے مہکانے میں منہمک نظر آرہا ہے، وہ نام حکیم منظور کا ہے۔ ان کے کلام کو عہد بہ عہد اور پہلو بہ پہلو پرکھا گیا اور بدلے میں یہی محسوس ہوا۔

میں دستِ وا کی طرح ہر لکیر اک قصہ
میں اک کتاب ہوں منظور اقتباس نہیں

اردو کے موجودہ شعری منظر نامے پر اب تک جن شعراء نے بہت جلد اپنی انفرادیت کی طرف سب کی توجہ مبذول کرائی ان میں حکیم منظور کا نام سرفہرست ہے۔ غلام رسول ملک حکیم منظور کے ادبی قد کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

'یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جدید اردو ادب کے مستند فن کاروں میں وہ شامل ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں اقبال کی وفات کے بعد اردو ادب کی دنیا میں جو خلاء پیدا ہوا تھا اسے آج تک کوئی شاعر پورا نہیں کرسکا ہے۔ فیض کی موت کے بعد یہ خلاء اور زیادہ نمایاں ہوگیا ہے۔ حق یہ ہے کہ فی الوقت اس خلا کو کوئی شاعر پورا کر بھی نہیں سکتا۔ ہاں ۱۹۳۸ء سے اب تک کے ممتاز شعراء کے بہترین کلام کا انتخاب کیا جائے تو اس کے ذریعے سے اس خلا کو کسی حد تک کم کیا جاسکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے انتخاب میں نظم اور غزل میں انکے مجموعی کارنامے کی بناء پر حکیم منظور کا نام ضرور شامل ہوگا۔'[1]

جہاں تک تخلیقی زبان کی تشکیل و تعمیر کا سوال ہے یہ عمل بلند حوصلے کا متقاضی ہے۔ روایت سے انحراف کرنا آسان ہے لیکن زبان کو متبادل شعری نظام فراہم کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ لیکن حکیم منظور جیسے بیدار ذہن شاعر نے تخلیقی زبان میں ایک جدید ترسیلی نظام قائم کر کے اردو شعری دنیا کو نئے موڑ سے آشنا کیا۔ دراصل یہ اپنے آپ میں ان کا ایک گراں قدر کارنامہ ہے۔

حکیم منظور اپنی تخلیقات کے بل پر بلند قامت شاعر قرار دیئے جاسکتے

[1]...... غلام رسول ملک۔ پیش لفظ (شعرآسمان) حکیم منظور

ہیں۔ انکے الفاظ وافکار کی روشنی میں ان کے مقام ومرتبے کا تعین کرتے وقت اردو شعری ادب کیلئے انکے Contribution سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ انہوں نے شعری ہیتی تبدیلیوں کے سلسلے میں کئی تجربے کئے جن میں وہ کامیاب نظر آرہے ہیں۔ معتبر ذرائع کے علاوہ راقم کی دورانِ ملاقات اس بات کا خلاصہ ہوا کہ حکیم منظور کی تخلیقات کووہ پذیرائی حاصل نہ ہوسکی جس کے وہ حقدار ہیں۔ بلکہ اس بات کے بھی کئی اشارات ملتے ہیں کہ ان کی شاعری عصری عصبیت کا شکار رہی ہے۔

دنیائے شعر وادب میں حکیم منظور کو انکی شعری کاوشوں کے صلے میں مناسب مقام نہ دیئے جانے کو مظفر ایرج 'عصری عصبیت' ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ خود حکیم منظور اس شکوے کو یوں شاعرانہ لبادہ پہناتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

اے ولر کی جھیل سن میری غزل
کہہ نہ گنگا کی طرح کیسی غزل

ڈاکٹر مجید مضمر حکیم منظور کے مندرجہ بالا شعر کو بنیاد بنا کر اس شکوے کو جائز قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

'پیر پنچال سے باہر کی سماعتیں اس شکوے سے آشنا ہوں جو اس میں ظاہر ہوا ہے اور جو کشمیر میں اردو کے جنیوین ادیبوں اور شاعروں کا ایک جنیوین شکوہ ہے'[1]

یہ حقیقت ہے کہ حکیم منظور نے کئی نئے چیلنج قبول کئے اور اردو شاعری کو نیا رنگ وآہنگ عطا کیا۔ یہ نیا رنگ وآہنگ یقیناً نامانوس لفظیات اور نادر تشبیہات وتراکیب پر مبنی ہے۔ حکیم منظور کی شاعری زندہ شاعری ہے اور اسکی نہج بالکل مختلف ہے پہلی نظر میں ان کے کلام کی تہہ داری قاری کیلئے ذہنی الجھن ضرور پیدا کرتی ہے لیکن آہستہ آہستہ معنی کے پرتیں کھلنے پر قاری کے ذوقِ جمال کو بھرپور غذا فراہم ہوتی ہے۔

[1]......ڈاکٹر مجید مضمر۔ رنگ باتیں کریں۔ ص ۱۰۴

کسی بھی فنکار کے مقام ومرتبے کا تعین چند چیزوں کو بنیاد بنا کر کیا جاتا ہے۔فنکار کی شخصیت اور تخلیقات کی روشنی میں جانچ پرکھ کا یہ عمل قاری نقاد یا محقق کو کسی حتمی فیصلے تک پہنچاتا ہے۔اس عمل میں ان بنیادی عناصر کے علاوہ مذکورہ شخصیت کے ہم عصر، عہد وماحول اور عصری تبدیلیاں بھی زیر نظر رہتی ہیں۔شاعری کے حوالے سے حکیم منظور کے ہاتھ وہ زمانہ آیا جب ریاستی شعری افق پر کئی نامور شعراء اپنی موجودگی کا احساس کرا چکے تھے اور حکیم منظور چونکہ بھیڑ میں گم نہ ہونے کا گُر اچھی طرح جانتے تھے لہٰذا انہوں نے ابتداء ہی سے ایک الگ راہ پر چل کر نئے اور منفرد اسلوب کا انتخاب کیا۔یہی چیز انکو اپنے ہم عصروں میں ممیز کرتی ہے۔یہ وہ وقت تھا جب کئی اہم شعراء بڑے انہماک کے ساتھ شعری اثاثے میں اضافہ کر رہے تھے۔ایسے ہی چند ہم عصر شعراء کے کلام کا سرسری جائزہ لینے کی ضرورت ہے تا کہ حکیم منظور کے مقام ومرتبے کا تعین کرنے میں آسانی ہو۔اس سلسلے میں چند اہم نام اس طرح ہیں۔شہ زور کاشمیری، میر غلام رسول نازکی، غ۔م۔طاؤس، شوریدہ کاشمیری، حامدی کاشمیری، مظفر ایرج ،سیفی سوپوری، تنہا انصاری، قیصر قلندر، فاروق نازکی، ہمدم کاشمیری، قاضی غلام محمد، غلام بنی ناظر، شجاع سلطان وغیرہ۔ان شعراء نے اردو کے ادبی روایات کو تنوع اور جدت سے ہمکنار کیا۔

شہ زور کاشمیری کا زمانہ ماقبل آزادی اور مابعد آزادی کا ہے۔یہاں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ کشمیر کے اردو شعراء کے شعری اثاثے پر کسی نہ کسی طرح سے علامہ اقبال کا اثر رہا ہے۔شہ زور کاشمیری نے اپنے عہد کے سماجی شعور اور عصری آگہی کو فن کارانہ انداز میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان کے ہاں کشمیر کا ابدی حسن بھی اپنے پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ جلوہ گر ہے۔موصوف گہرے مشاہدے، وسیع نظر اور بے مثال شعری قوت کے مالک ہیں۔ان کے ہاں روایت کی پاسداری بھی ہے اور کہیں کہیں انقطاع بھی، مگر باغیانہ پن نہیں۔جہاں

تک کلاسیکی آداب و اعلیٰ روایات کا تعلق ہے، کشمیر کے متعدد شعراء کے ہاں یہ عنصر موجود ہے مگر کسی کے ہاں اس میں تنوع زیادہ ہے اور کسی کے ہاں قدرے کم۔ شوریدہ کاشمیری بھی کلاسیکی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے عصری حسیت اور فکر و آگہی کو شعری جامہ پہناتے ہیں۔ غلام نبی ناظر اپنے ایک مضمون 'کشمیر میں اردو شاعری کے پچاس سال' میں شوریدہ کاشمیری کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

'شوریدہ کی شاعری میں کلاسیکی ترکیبات و استعارات ان کے شعری رویئے کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں روایتی خیال آرائیوں کے ساتھ تازگی تخیل اور پیکر تراشی کی نزاکت محسوس کی جاسکتی ہے۔ شوریدہ احساس جذبے اور مشاہدے میں دیانت داری، سادگی اور روایت کے پہلو بہ پہلو روانی اور مٹھاس بھی پیدا کرتے ہیں'[1]

حکیم منظور کے اہم ہم عصروں میں میر غلام رسول نازکی کا مقام بلند ہے۔ انہوں نے متعدد اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شاعری کی اہم خصوصیت کلاسیکیت کی مقدسیت اور روایت کی پاسداری ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال کا براہ راست اثر قبول کیا ہے۔ اور اصطلاحات و تلمیحات بھی تقریباً وہی ہیں جو علامہ اقبال کی شاعری کا خاصا رہا ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو

تمہارے ساتھ تھا ہر لمحہ نغمۂ جبرئیل
وہ نغمہ جس میں معانی کی روح تھی تحلیل

غ۔م۔ طاؤس کی شاعری کی اہم خصوصیات میں جدید ادبی تقاضوں اور معیاروں کا پاس ہے۔ انہوں نے غزل کو جدید ادبی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ غزل کے علاوہ انہوں نے اردو نظم میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ ان کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ انہوں نے کشمیر کی مٹی

[1]۔۔۔۔غلام نبی ناظر۔ (مضموں۔ جموں و کشمیر میں اردو شاعری کے پچاس سال) شیرازہ ص۔ ۱۲۸

اوراس کی بوباس سے اپنا شعری اثاثہ معطر کیا ہے۔ دیگر شعراء میں قیصر قلندر، تنہا انصاری، فاروق نازکی کے ہاں بھی عصری آگہی، جدید حسیت فکر کا تنوع اور مشاہدے کی وسعت بنیادی خصوصیات ہیں۔ قیصر قلندر چونکہ ریڈیو سے منسلک رہ چکے ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں موسیقی اور ڈرامائی ادب سے بھی گہرا لگاؤ رہا۔ اس طرح غیر شعوری طور پر ان کا شعری اثاثہ موسیقی کا عنصر لئے ہوئے ہے۔ تنہا انصاری کے ہاں کلاسیکیت اپنے جوبن پر دکھائی دیتی ہے۔ تاہم انہوں نے اپنی شعری روایات میں نئی راہوں کو بھی دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک فاروق نازکی کا تعلق ہے ان کے ہاں فکر کا تنوع اور مشاہدے کی وسعت اور اندازِ بیان کی جدت اہم خصوصیات ہیں۔ کشمیر کا حسن و جمال بھی ان کی شاعری کی خاص خوبی ہے۔

حکیم منظور کے دوسرے ہم عصروں میں اہم نام پروفیسر حامدی کاشمیری کا ہے جو غزل کے ساتھ ادبی تنقید میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے ہاں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ہی ساتھ جدید حسیت اور فکری تنوع اپنی مثال آپ ہے۔ جہاں تک حکیم منظور کا تعلق ہے وہ آزادی کے بعد کی شعری آواز ہے۔ موصوف اپنے ہم عصروں کی طرح ہی کشمیر کی مٹی اور اس کی بوباس سے استفادہ کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح ہی عصری آگہی اور جدید حسیت کو موضوع بنایا تو ہے لیکن ان کے ہاں فکری تنوع اور اسلوب کی جدت اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ حکیم منظور کے ہاں کشمیر کا حسن و جمال اپنے پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ جلوہ گر ہے لیکن یہاں بھی وہ اپنے اسلوب و افکار کے تنوع کی وجہ سے ہی اپنے باقی ہم عصروں سے الگ نظر آتے ہیں۔

میں ایک نمائندہ برف زادوں کی مملکت کا
نظر میں منظور میری ٹھنڈا دھواں نہیں

جہاں تک حکیم منظور کے شعری جہت کا تعلق ہے وہ باقی شعراء سے کئی اعتبار سے منفرد ہے۔ان کی شعری جہت میں فکر کا تنوع،عصری حسیت،روایت شکنی اور جدید تراکیب وعلامات شامل ہیں۔ان کے ہاں تازہ علامتوں کو جس نئے پیرائے میں استعمال کیا گیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ان کی شاعری تہہ داری کا عمدہ نمونہ ہے۔ان کا کلام بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے مگر بباطن انتہائی تہہ داری کا حامل ہے جس کی گتھیاں سلجھانا آسان نہیں۔مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

حساب مانگوں کس سے میں کس طرح کہ ابھی
دہائیوں میں بٹی ہیں اکائیاں میری

تجھے اے گل زرد رکھوں کہاں
پہاڑی کے اوپر ہے خوشبو کا گھر

حکیم منظور زندگی کو عصری تناظر میں دیکھتے ہیں اور اس کی پیچیدگی کو پیچیدہ علامتوں سے واضح کرتے ہیں۔حامدی کاشمیری بھی زندگی کی عصری معنویت کو علامتی انداز میں دیکھنے کے قائل ہیں۔ان کی خاص بات منفرد تخلیقی انداز واسلوب ہے۔حکیم منظور بھی اپنا ایک خاص تخلیقی اسلوب رکھتے ہیں۔موجودہ دور کی زندگی اور اسکا تہہ در تہہ کرب اور دیگر دلسوز مسائل اپنے پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ حکیم منظور کے تخلیقی اسلوب کا حصہ ہیں۔

حکیم منظور اپنے ہم عصر شعراء سے اس لحاظ سے بھی ایک منفرد مقام رکھتے ہیں کہ انہوں نے روایتی استعارات اور علامات کو نئے معنی پہنائے ہیں۔الفاظ ومحاورات کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ روایت سے قطعی طور پر انحراف نہیں کرتے مگر وہ اپنے تخلیقی تجربات کو جدید حالات اور عصری تناظر میں دیکھنے کی سعی کرتے ہیں۔حکیم منظور نہ صرف نسبتاً گہرے تخلیقی شعور کا احساس دلاتے ہیں بلکہ وہ لفظ وپیکر کی

فراوانی اورتازہ کاری کا بھی بھرپور احساس دلاتے ہیں۔

دوسرا بنیادی عنصر جو مقام و مرتبے کے تعین میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے وہ مذکورہ شخص کی اپنی شخصیت ہے۔ حکیم منظور کے اندر کا فرد خود پرست نہیں بلکہ خود دار ہے۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے۔ انہوں نے کبھی بھی جبیں سائی نہیں کی۔ اسی میں ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ اپنی شخصیت کے بارے میں کئی حقائق کا انکشاف کرتے ہوئے حکیم منظور لکھتے ہیں:

'میں بہت سارے لوگوں کے مقابلے میں بہتر ہونے کے باوصف پیچھے رہ گیا۔ کسی ادبی گروہ میں شامل ہونا میرے بس کی بات نہیں۔ نقد کے عوض نظر کروانے کو میں گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔ مجھے قطعاً یہ خواہش نہیں کہ میں جو نہیں اسکا دعویٰ کروں یا دوسروں سے ایسا کہنے کی توقع رکھوں یا ایسا کہلوانے کیلئے جوڑ توڑ کروں میں جو ہوں وہی ہوں اور اتنا ہی ہوں اور اتنا ہی رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری شاعری کا بہتر استحسان ہو کر ہی رہے گا۔'[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے حکیم منظور کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ ان کی شخصیت کا خاصا اثر ان کے کلام پر پڑا ہے۔ انہوں نے چہرہ بدلنا کبھی نہ سیکھا۔ اسی وجہ سے حاکم شہر سے بھی کبھی انکا یارانہ نہ رہا۔ اعزاز وافتخار کے لئے ارباب اقتدار کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے کا ذکر ان کی شاعری میں بھی آیا ہے۔ انکی دلی خواہش ہے کہ ان کی شاعری کا بہتر استحسان ہو کیونکہ وہ اپنی شاعری کی تمام تر قوتوں سے باخبر ہیں۔ چند اشعار بطورِ مثال ملاحظہ کیجیے:

1۔۔۔۔۔۔حکیم منظور۔سخن برف زاد۔(بہ قلم خود)

حکیم میرے شعر خود صلہ ہیں میرے واسطے
میرے ضمیر میں کہاں کوئی خطاب مانگنا

کھلی ہتھیلی کی طرح ہیں ہم کو سوچو پڑھ کر
بس اتنا چاہیں لقب نہ کوئی خطاب مانگیں

کوئی کس طرح مجھ سے چھینے مجھے
کہ ہوں آپ اپنا اک اعزاز میں

شفق بدن ہوں تہی دست ہوں سبب اسکا
میری لغت میں بس اک لفظ التماس نہیں

حکیم منظور نے اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں عصری تغیرات کو محسوس کرنے میں پہل کی اور تازہ استعارات، نادر تراکیب اور نیا طرزِ اظہار ان کے کلام کی پہچان بن گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ عصری تغیرات کو محسوس کر کے نئی راہ پر چل نکلنا کسی بھی فنکار کیلئے ایک اندھے موڑ پر چلنے کے مترادف ہوتا ہے۔ جہاں وہ اپنے تجربات کے ردِعمل کے بارے میں بے خبر ہوتا ہے لیکن جہاں تک حکیم منظور کا تعلق ہے انہوں نے اپنے شعری سفر کے اس اندھے موڑ کو نہ صرف اپنی تخلیقی آنچ سے روشن و منور کیا بلکہ افکار و پیکر کے ایسے ایسے جہاں آباد کئے جن میں حقائق کی تلخیاں بھی ہیں اور طلسماتی فضائیں بھی۔ حکیم منظور کے تمام تر شعری تجربات میں انکے عصری تغیرات کا اہم رول رہا ہے۔ شمیم حنفی حکیم منظور کے عہد کی عصری تبدیلیوں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"شعری سطح پر ہمارا زمانہ مسلمات سے انحراف کے معاملے میں

خاصا پر جوش رہا ہے اسی کے ساتھ ساتھ رسموں اور روایتوں کی پاسداری کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ کچھ شاعروں نے بیچ کی راہ یوں نکالی ہے کہ آزمودہ اور پرانے اسالیب اور نئے طرزِ احساس کا قصہ ان کے یہاں ساتھ ساتھ چلتا ہے۔[1]

حکیم منظور کا نام انہی بیچ کی راہ نکالنے والے شعراء میں سے ہے۔ یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ حکیم منظور کے کچھ ہم عصر شاعروں نے اردو چھوڑ کر کشمیری کی طرف رخ کیا۔ ان میں رحمان راہی، امین کامل اور فاضل کاشمیری کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ اس سلسلے میں حکیم منظور خود شاعر کی اپنی بساط کو کمزور ٹھہراتے ہیں۔ اردو میں ٹکے رہنا انکے نزدیک عزم واستقلال کا متقاضی ہے۔ اور بین الاقوامی سطح پر اپنی پہچان بنا پانا مشکل امر ہے۔ حالانکہ نوے کی دہائی میں حکیم منظور بھی کشمیری زبان کی طرف راغب ہوئے۔ لیکن اس میں انکی اردو سے کسی طرح کی مایوسی کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ بلکہ اپنی مادری زبان کی حق ادائیگی میں انہوں نے کشمیری شعری سرمائیے میں اضافہ کیا۔ ان کے دو کشمیری شعری مجموعات 'میہ چھ ورتن تے' اور 'دپیوم بالہ یارس' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ کشمیر کی طرف رغبت کے سلسلے میں وہ خود بتاتے ہیں:

'کشمیری کی طرف راغب ہونے میں میری کوئی مایوسی شامل نہیں۔ البتہ میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ کشمیری میں بھی باوزن شعر کہے جاسکتے ہیں۔'[2]

الغرض حکیم منظور کی تخلیقات کی روشنی میں ان۔ کے ادبی قد کی اونچائی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف ریاستی سطح پر شعری تاریخ میں سنہرے باب کا اضافہ کیا بلکہ برصغیر کے نمائندہ شعراء میں اپنے لئے ایک منفرد مقام بھی مخصوص کیا۔

[1]...... شمیم حنفی۔ سرورق، برف رتوں میں آگ۔ (حکیم منظور) [2] ایک انٹرویو

مظفرایرج حکیم منظور کے شعری مجموعے 'سخن برف زاد' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'سخن برف زاد' کی اشاعت نے نہ صرف حکیم منظور کا قد ادبی دنیا میں اور بھی اونچا کردیا ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے ریاست کی شاعری کی فرہنگ ہی بدل ڈالی ہے۔'[1]

حکیم منظور کا ایک بنیادی وصف یہ بھی ہے کہ وہ شاعر، ادیب ہونے کے علاوہ ایک اچھے مقرر بھی ہیں۔ یہ وصف جہاں انکے مقام و مرتبے میں اضافہ کرتا ہے وہیں سامع کیلیئے ذوقِ تسکین کا سامان بھی مہیا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں مظفرایرج لکھتے ہیں۔

'حکیم منظور نہ صرف اپنی تحریروں میں جدا اور ایک اونچے مقام پر کھڑے ہیں بلکہ ان کی تقریر بھی اتنی ہی پراثر معنی خیز، پرمغز اور رواں ہوتی ہے کہ سنجیدہ سامع کو تسکین بلکہ طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔'[2]

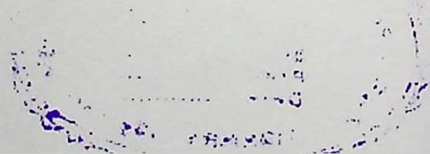
حکیم منظور کے قلم سے متعدد اشعار ایسے بھی نکلے ہیں جن میں وہ اپنے ہم عصروں سے تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے خود اپنے مقام کا تعین کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

اپنے پنجوں پہ کھڑے ہیں یہ بھی اونچے ٹھہرے
میں کہ اونچا ہوں کہ شانوں پہ ہے سر میرا ہی

دریا تو سر جھکائے ہوئے تہہ نشیں ہیں
لیکن غضب ہے نالوں کی رفتار تیز ہے

میرا قد منظور ان اونچے سفیدوں کی طرح
میرے شعروں میں ولر کی جھیل کی سی تازگی

۱۔۲..... مظفرایرج۔ تبصرہ۔ سخن برف زاد (حکیم منظور)





روق نظر

ڈاکٹر سیدہ نکہت فاروق نظر جہاں اپنی شعری صلاحیتوں کو سنوارنے،
رنے اور جلا دینے کی کوششوں میں مصروف نظر آرہی ہیں وہیں ادبی
وں میں ان کی تخلیقی توانائی اور جود موثر اور دلکش نمونے
نکہت نے ریاست جموں وکشمیر کے معروف اور مقتدر شاعر کی
ت اور شاعری پر تحقیقی کام کرکے ایک فریضہ ادا کیا ہے۔ انہوں
نی اور استدلالی طریقے سے کام کرکے تمام تخلیقی توانائیوں کو روشن کیا ہے جو
منظور کی ادبی انفرادیت کو استحکام عطا کرتی ہیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ حکیم
پر پہلی بار ایک مبسوط تحقیقی کام منظر عام پر آرہا ہے جس سے نہ صرف حکیم منظور
صیت اور ادبی قد وقامت کو سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ اس موضوع سے متعلق
حقیقی وتنقیدی کام انجام دینے میں سہولیت ہوگی۔

پروفیسر نذیر احمد ملک
شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی

میزان پبلشرز سرینگر